Regd. L. No. 7243 Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1976

۱ ۔ آدم نو کی تخلیق

(پرویز صاحب کا استقبالیہ)

۲ ۔ ذکر و فکر پرویز

(کنونشن کا خطاب)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک سالانہ پاکستان ـــــ ۱۸ روپے غیر ممالک ـــــ ۲ پونڈ	ٹیلی فون ۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ ۱ ½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۲۹	نومبر ۱۹۷۶ء	شمارہ ۱۱

فہرست

۱۔ لمعات ـــــــــــــــ ۲

۲۔ مطالب الفرقان (جلد دوم) ـــــــــــــــ ۷

۳۔ آدمِ نو کی تخلیق ـــــــــــــــ ۹

پرویز صاحب کا استقبالیہ
کنونشن منعقدہ ۱۹۷۶ء

۴۔ ذکر و فکرِ پرویز ـــــ تمھا اسلام۔ نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام (کراچی) ـــــ ۳۷

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس۔ ہسپتال روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جس وقت یہ سطور قلم بند کی جا رہی ہیں، ادارۂ طلوعِ اسلام کے ارباب حل و عقد اور بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے نمائندگان اور اراکین حالیہ کنونشن کی تیاریوں میں دن رات مصروف ہیں بزمِ لاہور کنونشن کی میزبان ہوتی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ امسال ملک میں عالمگیر سیلاب اور بارشوں کی وجہ سے جو تباہیاں اور نقصانات ہوئے ہیں، ان کی بناء پر کنونشن میں شرکاء کی تعداد پر اثر پڑے گا۔ لیکن اس وقت تک احباب کی آمد کی جو اطلاعات موصول ہوتی ہیں، ان سے ہویدا ہے کہ ہمارا یہ خدشہ بے بنیاد تھا۔ وابستگانِ تحریکِ قرآنی پہلے سے بھی زیادہ ذوق و شوق کے ساتھ اس اجتماع میں شرکت کے لئے آمادۂ سفر ہو رہے ہیں۔ یہ اجتماع اپنے انداز کا اور بالکل منفرد ہوتا ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کے ذاتی مفاد وابستہ ہوتے ہیں نہ نام و نمود کی شہرت۔ وابستگانِ فکرِ قرآنی ملک کے دور دراز گوشوں سے صعوباتِ سفر برداشت کر کے اپنے اپنے اخراجات پر یہاں پہنچتے اور چار پانچ دن، شب و روز کنونشن میں بسر کرتے ہیں۔ جذبۂ محرک صرف ایک ہوتا ہے —— یعنی قرآنِ کریم سے والہانہ وابستگی۔ کنونشن کے اجلاس ہوں یا ملحقہ قیام گاہ میں نجی محفلیں، ہر جگہ اور ہر وقت خدا کی اس کتابِ عظیم ہی کی باتیں ہوتی ہیں۔ بزموں کے خصوصی اجلاس میں اس فکر کی نشر و اشاعت کی توسیع اور فروغ کے لئے تجاویز پر غور کیا جاتا ہے اور اس کے بعد سال بھر کا پروگرام اپنے ساتھ لے کر شمعِ قرآنی کے یہ پروانے اپنے اپنے شہروں اور قصبوں کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اور سال بھر اس پروگرام کو عملی شکل دینے میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں۔ سالہا سال سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ نہ کسی سے چندہ مانگتے ہیں، نہ قربانی کی کھالیں اکٹھی کرتے ہیں۔ نہ زکوٰۃ، صدقہ یا فطرانہ جمع کرتے ہیں۔ اپنے جیب و داماں کی وسعت کے مطابق قرآنی فکر و تعلیم کے عام کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ نہ ان کا کوئی الگ، مذہبی فرقہ ہے نہ سیاسی جماعت، نہ ان کے دل میں کبھی یہ خیال ابھرتا ہے کہ ہم باقی مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ متقی اور پرہیزگار بن گئے ہیں۔

یہ اپنے آپ کو انہی میں کا ایک سمجھتے ہیں۔ یہی ہے ان کی وہ پُرخلوص روش اور للّٰہیت، جس کی وجہ سے یہ تحریک بغیر کسی خارجی سہارے کے دن بدن بڑھتی اور طاقت پکڑتی چلی جا رہی ہے۔ اس قسم کی آواز دنیا کے کسی اور گوشے سے سنائی نہیں دیتی۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ قارئین طلوعِ اسلام، جو اس اجتماع میں شریک نہیں ہو سکے، اس کی روئیداد سننے کے لئے ہمہ تن انتظار ہوں گے۔ لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ اشاعت ہٰذا میں یہ روئیداد شامل نہیں ہو سکتی۔ کنونشن ۲۱ تا ۲۴ اکتوبر منعقد ہوگی، اور یہ پرچہ اُس سے پہلے پریس میں چلا جائے گا۔ اس کی تلافی اس طرح کی جا رہی ہے کہ اس پرچہ میں کنونشن میں پیش کئے جانے والے دو اہم مقالات شائع کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو بانیٔ تحریک کا استفہامیہ ہے۔ انہوں نے اس کے لئے امسال جو عنوان منتخب کیا ہے، وہ بھی منفرد ہے یعنی —— آدمِ نو کی تخلیق —— آپ اس مقالہ میں دیکھیں گے کہ انہوں نے اُس عالمگیر بحران کا کس دقتِ نظر سے تجزیہ کیا ہے جس نے اس وقت ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اور اُس کے بعد قرآن کریم کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ انسانیت کا مستقبل جس قوم یا جماعت کے ہاتھ میں ہوگا۔ اُس کے افراد کی خصوصیات کیا ہوں گی۔ یہ گروہ اُسی جماعت کی خصوصیات کا آئینہ بردار ہوگا جسے قرآن کریم نے خیرِ اُمّۃ کہہ کر پکارا ہے، اور جس نے اسلام کے صدرِ اوّل میں تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا تھا۔

دوسرا مقالہ، بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کے نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب، کا ہے جس میں انہوں نے واقعاتی انداز میں بتایا ہے کہ طلوعِ اسلام کی فکر کیا ہے اور اس تحریک کے بانی کا اپنا مقام کیا۔ ایسے نازک موضوع پر، ذاتی جذبات سے الگ ہٹ کر، یکسر خارجی انداز میں گفتگو کرنا کارِ ہر دیوانہ نیست —— اسلام صاحب اس نازک ترین مرحلہ سے جس متوازن انداز سے گذرے ہیں ہم اس پر انہیں درخورِ تحسین سمجھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس مقالہ سے اُن الزام تراشیوں اور افترا پردازیوں کا پردہ چاک ہو جائے گا جو اس تحریک کے خلاف سالہا سال سے مسلسل اور پیہم پھیلائی جا رہی ہیں۔

کنونشن میں اور بھی کئی اہم مقالات پیش کئے جا رہے ہیں لیکن سب سے زیادہ اہمیت مفکرِ قرآن کے اس خطاب کو حاصل ہے جس میں انہوں نے مودودی صاحب اور اُن کی جماعت کی چہل سالہ تاریخ کی روشنی میں اُس گہری سازش کی نقاب کشائی کی ہے جو انہوں نے اسلام اور پاکستان کے خلاف شروع سے جاری رکھی ہے۔ اس خطاب کی جامعیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ کنونشن کے آخری دن (اتوار ۲۴ اکتوبر) کی صبح اور شام کی دونوں نشستیں اس کے لئے مخصوص کر دی گئی ہیں۔ یہ خطاب پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا ہے اور طلوعِ اسلام کی کسی اشاعت میں بھی ہدیۂ قارئین کیا جائے گا۔

کنونشن میں مذاکرہ کا عنوان بھی بڑا اہم اور زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے نہایت موزوں بلکہ انسب ہے۔ یعنی علامہ اقبالؒ کا یہ بصیرت افروز اور حقیقت کشا شعر کہ ؎

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اس مذاکرہ میں شرکت کرنے والے بیشتر طلباء و طالبات ہوتے ہیں ـــــ ابتدائی کلاسوں سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کے طالب العلم ـــــ نیز اساتذہ اور ایسے دانشور جنہیں تعلیم سے خصوصی تعلق ہو۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے شعر میں ایک بات کی تو حتمی طور پر نفی کر دی ہے ـــــ یعنی یہ کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب بے زری نہیں ـــــ اس کے بعد موضوعِ سخن یہ رہ جاتا ہے کہ پھر اس زوال کے اسباب کیا ہیں۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس پر ملتِ اسلامیہ کے بڑے بڑے مفکر صدیوں سے غور و فکر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس پر مقالات بھی لکھے گئے ہیں، کتابیں بھی تصنیف ہوئی ہیں۔ کنونشن کے مذاکرہ میں یہ دیکھا جائے گا کہ ہماری نئی نسل کے تعلیم یافتہ طبقہ کے نزدیک یہ اسباب کیا ہیں۔ اس سے آپ اس مذاکرہ کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مذاکرہ میں پیش کئے جانے والے مقالات طلوعِ اسلام میں شائع ہوتے رہیں گے لیکن، حسبِ معمول بالاقساط۔

کنونشن کی حسین ترین یادگار وہ تحفہ ہوگا جس کا وابستگانِ دامنِ قرآنی، سال بھر سے انتظار کر رہے تھے۔ یعنی پرویز صاحب کی تفسیر ـــــ مطالب الفرقان کی دوسری جلد ـــــ انہوں نے اس کی پہلی جلد سالِ گذشتہ کے کنونشن میں پیش کی تھی۔ یہ اپنے انداز کی بالکل نئی اور منفرد تصنیف ہے۔ اس میں قرآنی آیات کی تشریح خود قرآن کریم سے کی گئی ہے اور اس کے ساتھ انسانی علم مختلف شعبوں میں ہمارے زمانے تک جس سطح تک پہنچا ہے، اس کی روشنی میں قرآنی دعاوی کی صداقتوں کو ثابت اور نمایاں کیا گیا ہے اور مختلف طرق اور اسالیب سے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ عالمگیر انسانیت اپنی مشکلات کے جس حل کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہے وہ انہیں قرآنِ کریم کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتا۔ اس تفسیر میں اس دعویٰ کو محض عقیدت مندانہ انداز سے پیش نہیں کیا گیا، علم و بصیرت کی روشنی میں سامنے لایا گیا ہے۔ یہ کنونشن ہی کی نہیں، ہمارے نزدیک ہمارے دور کی بیش بہا متاع ہے جو صدیوں تک پائندہ و درخشندہ رہے گی۔

کنونشن کی دیگر تفصیلات کے لئے قارئین کو کچھ وقت کے لئے زحمت کشِ انتظار ہونا پڑے گا جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

محترم وزیرِ اعظم (مسٹر بھٹو) نے شروع اکتوبر میں، سعودی خبر رساں ایجنسی کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک ایسا نکتہ بیان ہے، جو گہرے غور اور فکر کا متقاضی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں

انہوں نے کہا کہ :-

> ایشیائی ممالک کو ویتنام اور کمبوڈیا سے اشتراکی یلغار کا کوئی خطرہ نہیں اور میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کمیونزم سراسر کسی ملک کے اندرونی حالات کے نتیجہ میں پھیلتا ہے۔ اگر عوام ناخوش ہوں۔ اگر رشوت اور بد دیانتی کا دور دورہ ہو۔ اگر انتظامیہ بد دیانت اور نا اہل ہو۔ اگر اقربا پروری اور کنبہ پروری کا دور دورہ ہو۔ بیروزگاری بڑھ گئی ہو۔ خواہ مخواہ مہنگائی ہو گئی ہو اور نا انصافیاں ہو رہی ہوں تو ایسے خطے کے لوگ ضرور باہر کی آوازوں پر کان دھرنے لگیں گے۔ (نوائے وقت۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء)

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم کمیونزم کی یلغار کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا کرتے ہیں۔ جب کسی خطۂ زمین پر سخت گرمی پڑے تو وہاں کی ہوا گرم ہو کر اوپر اٹھ جاتی ہے اور اس طرح خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے، دوسرے خطہ کی ہوا آندھی اور جھکڑ کی شکل میں ادھر کا رخ کر لیتی ہے۔ یہی صورت کمیونزم کی ہے۔ اس ازم کے پاس کوئی مثبت دعوت نہیں — یہ جھکڑ دوسرے ملکوں میں پیدا شدہ خلا کو پُر کرنے کے لئے آتا ہے۔ اسی کی تائید محترم وزیراعظم نے اپنے انٹرویو میں کی ہے۔ اگر صورتِ احوال کا تجزیہ یہی ہے (اور یہ تجزیہ بالکل صحیح ہے) تو پھر بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ کمیونزم کی انتہائی کامیابی ہے۔ اس وقت دنیا کے قریب قریب ہر ترقی پذیر ملک (DEVELOPING COUNTRIES) میں وہ خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں جن کا ذکر مسٹر بھٹو نے کیا ہے۔ ان حالات میں تو یہی نظر آتا ہے کہ ان ممالک میں کمیونزم کے سیلاب کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ اگر کوئی ملک اس خطرہ سے بچنا چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے خارجی تدابیر سوچے، اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے داخلی حالات کی اصلاح کی فکر کرے۔ مشینوں کی خرابیاں خارجی تدابیر سے رفع ہو سکتی ہیں، کیونکہ نہ ان کے پیدا کرنے میں مشین کے ارادے کا دخل ہوتا ہے، نہ ہی خرابی کے دور کرنے کی کسی تدبیر کے خلاف اس کے ردِ عمل کا محرک اس کا ارادہ ہوتا ہے لیکن انسان تو بالارادہ مخلوق ہے اس لئے اس کی خرابیاں بھی اس کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں اور ان کا ازالہ بھی اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ ان خرابیوں کو خرابیاں سمجھے اور ان کے ازالہ کا آرزومند ہو۔ کمیونزم نے کیا یہ ہے کہ انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق تصور کئے جانے کے بجائے اسے مشینوں کی طرح مجبور شے بنا دیا ہے۔ اس کا سارا فلسفہ جبریت (DETERMINISM) کا ہے۔

قوموں میں تبدیلی ان کی ذہنیت کے مطابق ہوتی ہے۔ ذہنیت خراب ہو جائے تو قوم میں ہر قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ذہنیت صحیح ہو جائے تو قوم کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور ذہنیت کا دار و مدار تعلیم اور تربیت پر ہے۔ ہماری خرابیوں کا باعث ہماری غلط تعلیم ہے۔ طلوعِ اسلام تشکیلِ پاکستان کے وقت سے برابر پکارتا رہا کہ نظامِ تعلیم کو صحیح خطوط پر متشکل کرو ورنہ قوم تباہ

ہو جائے گی۔ کسی نے اِس طرف توجہ نہ دی۔ موجودہ حکومت نے تعلیم کو اپنی تحویل میں لیا تو اِس سے کچھ امید بندھ گئی تھی کہ نظامِ تعلیم میں اصلاح ہو جائے گی لیکن عملاً ہوا یہ کہ حکومت نے درس گاہوں کی عمارتوں اور ان کے سامان کو تو اپنی تحویل میں لے لیا، نظامِ تعلیم ویسے کا ویسا ہی رہا، بلکہ نظم و نسق کی خرابی کی وجہ سے سابقہ نظام بھی متزلزل ہو گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ معاشرہ میں خرابیاں عام ہو گئی ہیں اور دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ اِس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ نظامِ تعلیم کو اخلاقی اقدار پر متشکل کیا جائے۔ یہ پروگرام اپنی تکمیل کے لئے وقت چاہتا ہے، لیکن قوم کی اصلاح کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔ کسی حد تک فوری اصلاح کی ایک صورت اور ہو سکتی ہے۔ ملک میں زود یا بدیر آئندہ انتخابات کا مرحلہ سامنے آئے گا۔ اگر اُس میں اخلاقی اقدار ——— امانت، دیانت، شرافت، صداقت وغیرہ ——— کو امیدواری کا معیار قرار دے دیا جائے؛ اور پارٹی ٹکٹ اِسی قسم کے امیدواروں کو دیا جائے تو ان کے برسرِ اقتدار آنے سے ایک حد تک فوری اصلاح کی صورت پیدا ہو سکے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیمی نظام کی اصلاح کے پروگرام پر بلا تاخیر عمل شروع کر دیا جائے۔ اِس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ ہم کمیونزم کی اُس یلغار سے بچ جائیں گے جس کی طرف محترم وزیرِ اعظم نے اشارہ کیا ہے۔ یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ پرویز صاحب نے حالیہ کنونشن میں اپنے استقبالیہ کا مرکزی موضوع اِسی نکتہ کو رکھا ہے۔ یہ استقبالیہ چند صفحات بعد سامنے آئے گا۔ قارئین اُس کا گہری توجہ سے مطالعہ فرمائیں۔

طلوعِ اسلام کے شائع کردہ پمفلٹ

قرآنی فکر کی نشر و اشاعت، طلوعِ اسلام کے شائع کردہ پمفلٹوں کے ذریعے بڑے وسیع پیمانے پر ہو سکتی ہے۔ مجلّہ طلوعِ اسلام مخصوص گوشوں تک پہنچتا ہے لیکن پمفلٹ دور دراز مقامات تک پہنچائے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کی فکر سے متفق ہیں اور اس کی عام اشاعت چاہتے ہیں تو ان پمفلٹوں کو اپنے حلقۂ اثر تک پہنچائیے۔ کنونشن کی تقریب پر حسبِ ذیل پمفلٹ شائع کئے گئے ہیں۔

(۱) **آدمِ نو کی تخلیق** } پرویز صاحب کا استقبالیہ جس میں بتایا گیا ہے کہ انسانیت کا مستقبل کن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ قیمت :- ایک روپیہ

(۲) **ذکر و فکرِ پرویز** } تحریکِ طلوعِ اسلام کا اصولی تعارف اور اس میں پرویز صاحب کا مقام۔ قیمت :- ایک روپیہ

(۳) **اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش** } مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کی چالیس سالہ تاریخ، خود مودودی صاحب کے الفاظ میں۔

ضخامت (۶۴) صفحات - قیمت :- -/۲ روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور

مطالب الفرقان کی دوسری جلد بھی شائع ہوگئی

قرآنِ مجید اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔

- یہ الفاظ تو آپ نے اکثر سُنے ہوں گے لیکن ان کی عملی تفسیر کم دیکھنے میں آئی ہوگی۔
- مفکرِ قرآن پرویز صاحب گذشتہ چالیس سال سے قرآنِ مجید کو اسی انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش میں مصروف چلے آ رہے ہیں۔
- اس کے لئے انہوں نے پہلے قرآنِ مجید کا ضخیم اور منفرد لغت مرتب اور شائع کیا۔
- پھر قرآنِ مجید کا مفہوم مرتب کیا جو تیس پاروں (تین جلدوں) میں شائع ہو چکا ہے۔
- قریب بیس سال سے مسلسل درسِ قرآن دیتے چلے آ رہے ہیں جو ٹیپ ریکارڈرز میں محفوظ ہے۔
- اب انہوں نے اس تمام تحقیق اور کاوش کے بعد، قرآنِ مجید کی مسلسل تفسیر کا سلسلہ .....

مطالب الفرقان

کے نام سے شروع کیا ہے۔

- اس تفسیر میں، زندگی کے اہم مسائل اور ہمارے زمانے کے تقاضوں کا حل، قرآنِ مجید اور عصرِ حاضر کے علوم کی روشنی میں نہایت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔
- اس کی پہلی جلد، سالِ گذشتہ شائع کی گئی تھی جو سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی ابتدائی (۲۹) آیات پر مشتمل تھی۔
- اب اس کی دوسری جلد بھی شائع ہو گئی ہے جو سورۂ بقرہ کی آیات (۳۰ تا ۱۱۲) پر مشتمل ہے۔ آیات کی تعداد تو کم نظر آئے گی لیکن آپ سوچئے کہ پونے پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ان آیات کی تشریح کیا کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے نہیں ہوگی۔

قیمت جلد اوّل - چالیس روپے — جلد دوم - پچاس روپے (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

لاہور میں ہر اتوار ۹ بجے صبح (فون ۸۰۸۰۰) ۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)	**لائل پور** ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) ۶۵- کوتوالی روڈ (فون ۲۸۱۱۹) حیات سرجری کلینک (بالائی منزل)
ملتان ہر جمعہ بعد نماز مغرب (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز- بیرون پاک گیٹ (فون ۷۲۰۷۱)	**کراچی** ہر اتوار ۹ ½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزم طلوعِ اسلام - دارالقائد ۲۰-۱/بی - ناظم آباد ۳ (فون ۶۱۰۴۷۸)
گجرات ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)	**راولپنڈی** ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی - ۱۲۶ لیاقت روڈ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ
اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ
جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۝

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

باسمہٖ تعالیٰ

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم، نقشِ دگر انگیزی

آدمِ نو کی تخلیق

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں
پرویز صاحب کا خطاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آدمِ نو کی تخلیق

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

رفیقانِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت۔

امسال بے پناہ سیلابوں نے جو قیامت برپا کی، اور کم و بیش سارا ملک تباہی اور بربادی کے جن طوفانوں کی لپیٹ میں آ گیا، اس سے مجھے اندیشہ تھا کہ ہمارے اس سالانہ اجتماع میں بھی شرکاء کی تعداد متاثر ہوگی، لیکن میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا، اور آپ احباب، حسبِ معمول، جس ذوق و شوق سے، کاروان در کاروان کنونشن میں شرکت کے لئے تشریف لائے اس نے ایک بار پھر اس حقیقت کو درخشندہ سے درخشندہ تر کر دیا کہ آپ کا جذبہ کس قدر صادق، اور آپ کا ولولہ کس قدر محکم اور پائدار ہے جو حوادثِ ارضی اور سماوی کے ایسے دشوار گذار موانع بھی آپ کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔ آپ غور فرمایئے کہ اس تقریب میں کونسی جاذبیت ہے جو آپ کو صعوباتِ سفر کی پرواہ کئے بغیر، رواں دواں اس کی طرف کھینچ لاتی ہے؛ یہ نہ کوئی (عرفِ عامہ میں) مذہبی تقریب ہے جس میں "ثواب" کا لالچ موجبِ کشش بنتا ہے، اور نہ کوئی (دورِ حاضرہ کا) سیاسی اجتماع جس میں دنیاوی مفاد کی مقناطیسی جاذبیت دامن کش ہوتی ہے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام سے وابستگی، اور اس کی اس قسم کی تقریبات میں شرکت، میں ایثار ہی ایثار ہے۔ کوئی دنیاوی منفعت (پیش پا افتادہ یا مستقبل میں متوقع) مضمر نہیں ہوتی۔ اس تمام زحمت کشی اور صعوبت انگیزی، مفاد فراموشی اور ایثار شعاری کا جذبۂ محرکہ ایک اور صرف ایک ہے — یعنی خدا کی کتابِ عظیم سے والہانہ عشق اور اس حقیقت پر ایمانِ محکم کہ اس کی روشنی میں قائم کردہ نظام ہی میں نوعِ انسان کی نجات و سعادت کا راز پوشیدہ ہے۔ یہی وہ عشق اور ایمان ہے جو آپ احباب کو اتنے دور دراز گوشوں سے کھینچ کر، اس مرکزِ قرآنی میں یوں یک جا کر دیتا ہے کہ اس میں کسی قسم کی کوئی تفریق و تمیز باقی نہیں رہتی، اور — تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے — کا فردوسی منظر وجہ نورانیتِ قلب و نگاہ بنتا ہے۔ خدا کی اس عظیم کتاب کا یہ کتنا بڑا احسان ہے جس سے ہم کسی صورت میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے ہے

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل نسیمِ صبح! تیری مہربانی

اسی لئے تو ارشادِ خداوندی ہے کہ:-

بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ۔ (۴۹/۱۷)

یہ خدا کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے تمہاری راہ نمائی منزلِ ایمان کی طرف کر دی۔

عزیزانِ من! جیسا کہ آپ نے میرے آج کے خطاب کے موضوع سے اندازہ لگا لیا ہوگا، میرے پیشِ نظر اس تباہی کا دلسوز اور جگر خراش تذکرہ ہے جو نہ کسی خاص خطۂ زمین تک محدود ہے اور نہ کسی خاص قوم یا مملکت سے مخصوص۔ یہ اس جہنم کا جاں سوز قصہ ہے جس میں آج پورے کا پورا عالمِ انسانیت

عالم گیر فساد

جھلس رہا ہے اور جس سے نکلنے کی کوئی راہ وہ اپنے سامنے نہیں پاتا۔ قرآنِ کریم نے اپنے زمانۂ نزول کی عالم گیر تباہی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ:-

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ... (۳۰/۴۱)

کرۂ ارض پر، خشکی اور تری میں، ہر جگہ فساد برپا ہے اور یہ سب، لوگوں کا اپنا کیا کرایا ہے۔ اس کے ذمہ دار خود ان کے خود ساختہ نظامِ حیات ہیں۔

اُس زمانے میں، دنیا میں روم اور ایران کی دو سب سے اہم تہذیبیں تھیں۔ اور یہ دونوں پستیٔ اخلاق و کردار کے جن عمیق گڑھوں میں گر چکی تھیں، ان پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔ لیکن دنیا کی جو حالت آج ہو چکی ہے، اس میں اِس فساد کی وسعتیں حدود فراموش اور طغیانیاں ساحل ناآشنا ہیں۔ آج، وسائلِ رسل و رسائل کی عمومیت اور ذرائعِ مواصلات و ابلاغ کی عالمگیریت سے، ساری دنیا سمٹ کر ایک قطعۂ ارض بن گئی ہے۔ جس میں اُن انسانیت سوز خرابیوں کے جراثیم وبائی امراض کی شکل اختیار کر چکے ہیں، جن سے اس کا کوئی گوشہ تک محفوظ نہیں رہ سکتا۔ قرآنِ کریم نے ایک آنے والے دَور کے متعلق کہا تھا کہ: كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا۔ (۷۶/۷) "اس میں شر کی چنگاریاں فضا میں اُڑتی پھریں گی۔" میں سمجھتا ہوں کہ اس میں، ہمارے ہی دَور کی طرف اشارہ ہے جس میں اقبالؒ کے الفاظ میں کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ ——— شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب ——— اس میں مشرق و مغرب سب اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ اس میں حالت یہ ہے کہ ——— عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ ——— اور اس کی وجہ ہے، یا یوں کہئے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ——— نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری ——— بہرحال یہ ہے وہ عالمگیر تباہی کا جہنم جس میں آج ساری دنیا مبتلائے عذاب ہے اور جس سے نکلنے کی کوئی راہ کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا اس قسم کا منظر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔

اقبالؒ نے آج سے بہت پہلے کہا تھا کہ؎

دیا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

یہ آج سے کوئی چالیس سال پہلے کی بات ہے، لیکن اس کے بعد، یورپ کے جراحت ہائے پنہاں کے درد

یورپ کا واویلا

کی شامت اس قدر بڑھ گئی کہ اس کی چیخ و پکار نے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد رابرٹ بریفو نے لکھا تھا کہ:

یہ جنگ مع اپنے تمام بہیمانہ مظاہروں کے جن کی وجہ سے آج ہمارا شعور گوناگوں وحشت انگیزیوں کا مسکن بن رہا ہے، کوئی ہنگامی واقعہ یا اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ یہ تمام مجرمانہ حماقتیں، تمام منافقتیں، تہمت تراشیاں اور دروغ بافیاں، یہ تمام سنگدلانہ حرکات، انسانی زندگی اور قوت اور دولت کی یہ تمام بربادی اور دہشت انگیز تباہی۔ غرضیکہ یہ پورے کا پورا پاگل پن اور اس کا ایک ایک عنصر، ہماری قبل از جنگ کی مغربی تہذیب کے اندر موجود تھا۔ جنگ دراصل ان تمام مذموم افعال اور نفرت انگیز اعمال کا مرئی اور بالمحسوس مظاہرہ تھا جن کی مسموم فضا میں ہم گھرے ہوئے تھے۔ جنگ نے صرف اتنا ہی کیا کہ ان بھیانک چہروں سے نقاب الٹ دیا۔ (THE MAKING OF HUMANITY)

اسی دور کے ایک ماہر تجزیہ نفس، ڈاکٹر ولیم سٹیکل نے لکھا تھا:

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جرائم عام ہو چکے ہیں۔ چوری ایک مہذب ہنر بن چکی ہے، صرف اس کا نام بدل دیا گیا ہے۔ اب اسے کاروبار (بزنس) کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ قتل ایک عام بات ہو چکی ہے۔ سرمایہ شہنشاہِ مطلق ہے۔ جنگ سے سہل انگاری عام ہو چکی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ کسی طرح مفت میں دولت ہاتھ آ جائے اور کام نہ کرنا پڑے۔ اخلاق کا معیار بہت پست ہو گیا ہے۔ معاشرہ کی شرم کا اب احساس تک نہیں رہا۔ اب شرم صرف اسے آتی ہے جو دوسروں کا خون چوسنے میں ناکام رہ جاتا ہے۔ جنگ کے بعد قماربازی کا چسکا عام ہو گیا ہے حتیٰ کہ اب وہ جنون کی کیفیت اختیار کر چکا ہے۔ جوئے کی سینکڑوں مہذب قسمیں ایجاد ہو چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شراب خوری۔ اس سے بوڑھے، بچے سب کی قوتِ عمل تباہ ہو جاتی ہے۔ اور لوٹ مار، اور تباہ کاری کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔

(PECULIARITIES OF BEHAVIOUR)

آپ غور کیجئے حضرات! اگر میں یہ نہ بتاتا کہ اس میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد، اقوامِ مغرب کا نقشہ کھینچا گیا ہے، تو آپ یہی سمجھتے کہ یہ خود پاکستان کا تذکرہ ہو رہا ہے! بہرحال، اس اخلاقی پستی کا آغاز

ف: اس خطاب میں کئی باتیں ایسی آئیں گی جنہیں میں اس سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں۔ لیکن دنیا کے حالات اس قدر ابتر ہوتے جا رہے ہیں کہ انہیں بار بار دہرانے کی ضرورت ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے ہوا اور جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا، حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی — حتیٰ کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہ خرابیاں انتہائی شدت اختیار کر گئیں۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں لارڈ سنل کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی (THE NEW WORLD) اس میں اس نے لکھا تھا:

> نوعِ انسان کی پوری تاریخ میں اس قسم کا دور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وقت تہذیب ایک دوراہے پہ کھڑی ہے اور یہاں سے اگر ایک قدم بھی غلط سمت کی طرف مڑ گیا تو وہ اسے برباد بلکہ فنا کر دے گا۔ یوں تو انسان کی طول و طویل تاریخ میں بہت سے حوادث آئے ہیں لیکن موجودہ حادثہ نہ صرف ان سے وسعتوں اور پہنائیوں میں بڑا ہے بلکہ یہ ان سب سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے۔ پہلے حوادث خاص خاص خطوں میں رونما ہوا کرتے تھے اور متعین مسائل سے متعلق ہوتے تھے۔ جنگ ہوتی تھی تو کسی خاص مقصد کے لئے —— کبھی خام پیداوار کے لئے۔ کبھی خام مال کی منڈیوں کی تلاش میں۔ کبھی دفاعی مؤقف کی غرض سے ..... لیکن گذشتہ جنگ کو دیکھئے۔ اس کی ظلمت انسانی قلوب کی گہرائیوں میں دکھائی دے گی —— نسلی تفاخر۔ تغلب و تسلط کے جذبات اور مملکت کے متعلق غلط تصور۔
>
> لہٰذا جو مصیبت ہمارے سامنے ہے اس کے متعلق ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے پہلے منظم شر کی قوتیں کبھی اس قدر زور آور نہیں ہوئی تھیں۔ اب تو ان سے نجات کا راستہ ہی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر ملک ویرانہ بن رہا ہے اور اس ویرانہ پر افلاس، امراض اور اموات کے شیاطین مسلط رہے ہیں...... نوعِ انسان اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں سے کچلی جا رہی ہے، تباہ ہو رہی ہے۔

یہ تو ہے انسانی معاشرہ کی اجتماعی تباہ کاریوں کا تذکرہ۔ اس معاشرہ کے اندر خود فرد کی کیا حالت ہے۔ اس کے متعلق مشہور امریکی مفکر ممفورڈ لکھتا ہے کہ:

> ہم تاریخ میں اس مقام پہ پہنچ چکے ہیں جہاں انسان خود اپنا بدترین دشمن بن چکا ہے..... مغربی کلچر انسان کا ترجمان نہیں رہا۔ یہ انسان سے باہر کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور خود انسان کا دشمن ہے...... اس تہذیب کے خلاف اس سے شدید تر تنقید اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ علاوہ اس کے کہ اس کے ذریعے انسان اپنے اوپر آپ تباہیاں لا رہا ہے، اسے انسانی زندگی سے کچھ دلچسپی نہیں ...... اس تہذیب کا ماحصل یہ ہو گا کہ اس قسم کے مشینی انسان پیدا ہوں گے جو نہ اپنے لئے آپ فیصلہ کر سکنے کے قابل ہوں گے اور نہ ہی زندگی

کی شاہراہ متعین کر سکنے کے اہل۔ (THE CONDUCT OF LIFE)

ہمارے زمانے میں، علمِ تجزیۂ نفس (PSYCHO ANALYSIS) انسان کی اندرونی دنیا سے متعلق مسائل کی بنیادی وجوہات کے سلسلہ میں بڑی تحقیق کر رہا ہے۔ اس فن کے مشہور ماہر، ڈاکٹر ینگ نے ہزاروں مریض نوجوانوں کے تجزیۂ نفس کے بعد ایک کتاب لکھی (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) وہ اس کتاب میں لکھتا ہے:۔

> عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندرسے حوادث کے مقابلہ سے ہراساں۔ یعنی ان وحشی قوتوں کے مقابلہ میں جن پر وہ اپنے دور کی معاشی اور سیاسی تدابیر کے زور سے قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی دنیا کی حالت۔ اور اگر وہ اس اندھی دنیا سے جہاں تخریب و تعمیر کی قوتیں ہر وقت ترازو کے پلڑوں کو اٹھاتی جھکاتی رہتی ہیں، اپنے اندر کی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

یہ وہ تاریکیاں ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے، ابلیس کی زبان سے، کہلوایا تھا کہ ؎

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام   چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

خود اقبالؒ نے اس بدنصیب انسان کے قلبی اضطراب کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

> وہ اپنے فکر کی دنیا میں خود اپنی ذات کے خلاف ستیزہ کار رہتا ہے۔ اور سیاسی دنیا میں دوسروں کے خلاف نبرد آزما ــــ اور نہ اپنی کنفِ بے لگام سرکشی کو منضبط میں لا سکتا ہے، اور نہ ہی ہوسِ زر پرستی کی ناقابلِ تسکین تشنگی کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتا ــــ یہی وہ چیزیں ہیں جو اس کے تمام بلند مقاصد کو (ایک ایک کر کے) تباہ کر رہی ہیں اور ایسی کیفیت پیدا کر رہی ہیں کہ وہ زندگی کے ہاتھوں بیزار ہے۔ وہ نگاہ فریب مناظر میں جذب ہو کر اپنی ذات کی گہرائیوں سے یکسر منقطع ہو چکا ہے۔ اس کی منظم مادہ پرستی کے میدان میں اس کی توانائی پر وہ فالج گر چکا ہے جسے ہکسلے کی نگاہ نے بھانپا اور اس پر اظہارِ تاسف کیا تھا۔ (خطبات صفحہ ۱۷۸)

انہوں نے عصرِ حاضر کے انسان کی اس کیفیت کو بالِ جبریل میں دو مصرعوں میں اس طرح سمٹا کر بیان کیا ہے کہ ؎

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی   کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری

میں چاہتا تو اس موضوع پر بیسیوں شہادات کا اضافہ کر سکتا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایک تو اس لئے کہ قلتِ وقت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اور دوسرے اس لئے کہ یہ اخلاقی پستیاں، یہ تباہیاں اور بربادیاں، ہمارے لئے اب جگ بیتی نہیں رہیں، آپ بیتی بن چکی ہیں۔ یہ سب ہمارے ہاں کی روزمرہ کی زندگی کا معمول بن چکی ہیں جن کے ہاتھوں ہم میں سے ہر شخص نالاں ہے لیکن ان کا کوئی مداوا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لہٰذا مجھے، مزید شہادات پیش کئے بغیر آگے بڑھ جانا چاہیئے، یہ دیکھنے کیلئے

کہ ان مفکرین کے نزدیک، ان تباہیوں کا بنیادی سبب کیا ہے۔ یہ بات بڑے غور سے سننے اور سمجھنے کے قابل ہے۔

مسیحی مفکر، شئین نے، اپنی ایک کتاب (فلاسفی اوف ریلیجن) میں ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:-

> یہ ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق تاریخ سے کی جا سکتی ہے کہ جب کبھی سائنٹیفک زاویۂ نگاہ میں کوئی بڑی تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ایسے مفکر پیدا ہو جاتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ بنیادی اور ابدی صداقتوں میں بھی اسی زاویۂ نگاہ کے مطابق تبدیلی پیدا کر دی جائے۔ جب اٹھارویں صدی میں نیوٹن کے نظریہ کے ماتحت خارجی کائنات کے متعلق ایک نیا تصور قائم ہوا تو اس کے ساتھ ہی اس کا بھی تقاضا شروع ہو گیا کہ اب دنیا کو مذہب بھی نیا ملنا چاہیئے۔ چنانچہ اس کے مطابق ایک نیا مذہب بھی پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے تقاضا کیا کہ اخلاقیات، ادب اور مابعد الطبیعیات کو اپنے بنیادی اصول اور جوہر بدل لینے چاہئیں تاکہ وہ اس سائنٹیفک زاویۂ نگاہ کے مطابق ہو جائیں۔ (P. 7)

شئین نے تو نیوٹن کی مثال دی ہے۔ خود ہمارے زمانے میں جب آئن سٹائن نے نظریۂ اضافیت (RELATIVITY) پیش کیا تو ویسٹر مارک نے کہا تھا کہ اخلاقیات کو بھی اضافی (RELATIVE) ہونا چاہیئے، نہ کہ مطلق (ABSOLUTE)۔ بالفاظِ دیگر بات یہ کہی گئی کہ خارجی کائنات کے متعلق سائنس کے انکشافات جو تصور پیش کریں، اخلاقی اقدار کو بھی انہی کے مطابق ڈھلتے اور بدلتے رہنا چاہیئے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں، یورپ میں مادّہ (MATTER) کے متعلق بڑے وسیع پیمانے پر سائنسی تحقیقات ہوئیں۔ انہی میں نظریۂ ارتقاء (THEORY OF EVOLUTION) بھی تھا۔ یہ نظریہ اس حد تک تو صحیح تھا کہ زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، اوّلیں جرثومہ سے درجۂ حیوانات تک پہنچی ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ بھی کہا گیا کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح، طبیعی جسم سے عبارت ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اس کا دماغ، دیگر حیوانات کے مقابلہ میں ذرا بڑا ہے، اس لئے اس میں عقل و شعور کی صلاحیت نسبتاً زیادہ ہے۔ اس سے زیادہ انسان اور دیگر حیوانات میں کوئی فرق نہیں۔ اس کی زندگی بھی طبیعی قوانین کے تابع ہے ——— یہ بھی عام حیوانات کی طرح، کھاتا پیتا۔ افزائشِ نسل کرتا ہے اور اس کے بعد موت اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس باطل نظریہ کا اثر، انسانی زندگی پر کیا پڑا، یہ چیز قابلِ غور ہے اور موجودہ عالمگیر انسانی تباہیوں کا بنیادی سبب۔ حیوانات کا مقصد اپنے آپ کو زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے انہیں طبیعی سامانِ زیست (کھانے پینے کی چیزوں) کی ضرورت

اس کا سبب

ہوتی ہے۔ ان ضروریات کے پورا کرنے کے لئے ان کے سامنے جائز اور ناجائز کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ (مثلاً) ایک بھوکا بیل باہر جاتا ہے تو جو کھیت سب سے پہلے اس کے سامنے آتا ہے، وہ اس میں سے چرنے لگ جاتا ہے، بلاتمیز اس کے کہ وہ کھیت اس کے مالک کا ہے یا کسی اور کا ۔۔۔ اپنے کھیت اور دوسرے کے کھیت کی یہ تمیز انسانی سطح کا خاصہ ہے۔ حیوانی زندگی میں یہ امتیاز ہوتا ہی نہیں۔ اسی تمیز و تخصیص کو "جائز اور ناجائز" میں فرق کہا جاتا ہے، اور اسے اصطلاح میں حسنِ قدر یا (VALUE) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اقدار کا تصور انسانی سطح کا خاصہ ہے۔ حیوانات میں یہ چیز مفقود ہوتی ہے۔ وہ، اقدار کے تصور سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ یورپ کی سائنسی تحقیقات نے یہ تصور پیدا کیا کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح ایک حیوان ہے۔ اس نظریہ کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کے سامنے اقدار کا تصور نہ رہا۔ اس لئے بھی زندگی کا مقصد، اپنی طبیعی ضروریات کا پورا کرنا سمجھ لیا؛ اور بس۔

اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

درنگاہش آدمی آب و گل است　　کاروانِ زندگی بے منزل است

قرآنِ کریم نے اس نظریہ کو کفر کہہ کر پکارا ہے، اور اس کا نتیجہ جہنم۔ سورۂ محمدؐ میں ہے:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۔ (۴۷/۱۲)

جن لوگوں کا تصورِ زندگی حیوانات کی طرح کھانا پینا اور دیگر سامانِ زیست سے متمتع ہونا ہے، اور بس۔ وہ کفر کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس زندگی کا نتیجہ جہنم ہے۔

اس آیت سے دو اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اقدار کا تصور، کفر اور اسلام میں مابہ الامتیاز ہے۔ جس زندگی کا مقصد محض طبیعی ضروریات کا پورا کرنا ہے، وہ کفر کی زندگی ہے۔ اسلام کی زندگی وہ ہے جس میں اقدار کی پابندی مسلکِ حیات ہو۔ اور دوسری بات یہ کہ اقدار کو نظرانداز کر دینے سے جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ عذابِ جہنم میں مبتلا ہوگا ۔۔۔ اس دنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی ۔۔۔ اس دنیا کا جہنم آج ہم سب کے سامنے ہے۔

سیکولرازم

اقوامِ مغرب نے اپنے نظامِ سیاست کی بنیاد اس (جدید) نظریۂ حیات پر رکھی۔ اسے سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں مطلق اور غیر متبدل اقدار کا تصور نہیں ہوتا۔ اپنی تمدنی زندگی کے لئے معاشرہ جس قسم کے قوانین چاہے مرتب کرلے۔ لیکن مارکس اس سے ایک قدم آگے بڑھا۔ اس نے اس حیوانی نظریہ پر اپنے معاشی نظام کی بنیاد رکھی، جسے کمیونزم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ اخلاق و اقدار کے تمام تصورات، عہدِ پارینہ کی فرسودہ کہانیاں ہیں جو جہالت اور توہم پرستی کی پیدا کردہ ہیں۔ انسان کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے ۔۔۔ نیوٹ ہارج

(LUDWIG FEUREBACH) کے الفاظ ہیں:-

MAN IS WHAT HE EATS

یعنی "انسان عبارت ہے اس سے جو کچھ وہ کھاتا ہے"۔ (ESSENCE OF CHRISTIANITY)

خود مارکس نے اپنی کتاب (کیپٹل۔ جلد اوّل) میں لکھا کہ:-

> اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعیات، اور اسی قسم کے دیگر نظریات کا آزادانہ وجود کوئی نہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ ان کا کوئی نشو و ارتقاء نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان اپنی مادی پیداوار اور مادی روابط کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات، اور ان خیالات سے پیدا شدہ تصورات کو بدلتا رہتا ہے۔ (انہی کا نام عقائد و اخلاقیات اور اقدار ہیں۔)

مارکس کے رفیقِ اوّل، اینگلز نے کہا کہ:-

> (ہمارے فلسفۂ حیات کی رُو سے) دنیا میں کوئی شے حرفِ آخر، مطلق یا مقدس نہیں۔ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے اور پیچھے سے آئی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

اور لینن نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ:-

> ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق البشر سرچشمہ یا غیر طبیعاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصوّر فریب ہے، دھوکا ہے۔ یہ تصوّر جاگیرداروں اور سرمایہ کاروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر، محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے ..... سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق، احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے۔ ہم اُسے مانتے ہی نہیں ..... ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔[1]

مختصر الفاظ میں، کمیونزم نے یہ تصور عام کیا کہ انسان کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے اور اس مسئلہ کا حل، تمدن و سیاست کا بنیادی اور منفرد فریضہ ہے، خواہ وہ کسی طریق سے ہو۔ کمیونسٹ ممالک میں تو اس تصور کا عام ہونا فطری امر تھا، لیکن کمیونزم کے پراپیگنڈہ کا نتیجہ یہ ہے کہ جو ممالک کمیونزم کے مخالف ہیں، ان میں بھی یہ تصور عام ہو گیا ہے۔ یعنی اس وقت دنیا کا کوئی گوشہ

---

[1] ان اقتباسات کے حوالوں کے لئے، میرا پمفلٹ ـــــ اسلامی سوشلزم۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ایسا نہیں جہاں انسانی زندگی کا سارا مسئلہ "روٹی۔ کپڑا اور مکان" نہ قرار پا گیا ہو۔ اس میں کمیونسٹ ممالک اور غیر کمیونسٹ ممالک۔ مسلم مملکتیں اور غیر مسلم مملکتیں۔ مغربی اقوام اور مشرقی اقوام، سب شامل ہیں ——— روٹی۔ روٹی۔ روٹی، ہر ایک کی زبان پر ہے۔ اقدار کا لفظ تک کہیں سنائی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مارکس بڑا کامیاب ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کا پیش کردہ نظریۂ حیات تسلیم اور اختیار کر لیا جائے۔ سو ایسا ساری دنیا میں ہو گیا ہے۔ سعدی نے کہا تھا کہ ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق — کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس قحط سالی میں تو معلوم نہیں کہ عشاق نے عشق فراموش کر دیا تھا یا نہیں۔ لیکن ہمارے زمانے نے تو اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ روٹی کے مسئلہ نے اتنی اہمیت حاصل کر لی ہے کہ عالمگیر نوع انسان یکسر اقدار فراموش ہو گئی ہے۔ آج زندگی کا روٹی سے بلند کوئی مطالبہ رہ گیا ہے، نہ دعوت دینے والے روٹی مہیا کرنے کے علاوہ کوئی وعدہ کرتے ہیں۔ سوچئے کہ یہ رشتہ، کہار اور اس کے گدھے کے رشتے سے ذرا بھی مختلف اور بلند ہے؟

اس میں شبہ نہیں کہ روٹی کا مسئلہ اپنی جگہ بڑا اہم ہے کیونکہ انسان کی طبیعی زندگی کا مدار اس پر ہے۔ لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ——— ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ بلند مقصد ہے غیر متبدل اقدار کا تحفظ۔

اقبال کے الفاظ میں :؎

نگر خود را بہ چشم محرمانہ — نگاہ ماست ما را تازیانہ

تلاش رزق ازاں دادند ما را — کہ باشد پر کشودن را بہانہ (ارمغان حجاز)

اس کا مفہوم اس نے اردو شعر میں اس طرح بیان کیا تھا کہ ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اگر روٹی کا مسئلہ مقصود بالذات بن جائے تو یہ (قرآن کی رو سے) کافرانہ تصورِ حیات ہوگا۔ جس کا نتیجہ جہنم ——— اس سے انسان، حیوانی سطح زندگی پر اتر آئے گا جس میں "جنگل کا قانون" مسلکِ حیات قرار پا جاتا ہے۔ یہی وہ مسلکِ حیات ہے جس سے آج ساری دنیا کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ ؎

آدمی بر آدمی دیگر چرد — دانہ این می کارد آں حاصل برد

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است — از تن شاں جاں ربودن حکمت است

شیوۂ تہذیب نو آدم دری است — پردۂ آدم دری، سوداگری است (پس چہ باید کرد)

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ موجودہ عالمگیر تباہی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انسان، حیوانی سطح زندگی اختیار کر چکا ہے جس کی وجہ سے بلند انسانی اقدار کا تصور گم ہو گیا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احساس خود اقوام مغرب کے مفکرین کو بھی ہو رہا ہے۔ لارڈ سنل (جس کی کتاب کا اقتباس شروع میں پیش کیا جا چکا ہے) موجودہ دور کی تباہ کاریوں کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ اس

کی وجہ یہ ہے کہ:-

> دینیات تشکیک، اور اخلاقی اقدار کی شکست کا اندوہناک احساس، انسانی قلوب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

اخلاقی اقدار کا ابدی اور غیر متبدل ہونا ضروری ہے۔ اس قسم کی اقدار صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہیں اور وحی اپنی منزہ شکل میں آج، اس آسمان کے نیچے، قرآن مجید کے سوا کہیں نہیں ۔۔۔۔۔۔ لہٰذا تباہیوں کے موجودہ جہنم سے نکلنے کے لئے سب سے پہلی شرط، ان اقدار کی صداقت پر غیر متزلزل یقین محکم ہے۔ جسے اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ ایمانؔ کی اہمیت کس قدر ہے، اس کے لئے مغربی مفکر، الفریڈ کوبن کی یہ شہادت سامنے لایئے کہ:-

> جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ انسان، ایمان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے اسے دورِ حاضر کے نوجوانوں کی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو اس تلاش میں مضطربانہ گھوم رہے ہیں کہ کوئی ایسی شے مل جائے جس پر ایمان لایا جا سکے۔[۱]

ایمان کے لئے انسان کی اس مضطربانہ تلاش کی کیفیت کیا ہے، اس کیلئے مغرب کے مشہور فلاسفر پیکال کے یہ الفاظ گہری توجہ کے محتاج ہیں۔ اس نے لکھا ہے:-

> انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے اور اسی طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ جب اسے ایمان اور محبت کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بے کار اور نکمی اشیاء سے چمٹ جاتا ہے۔ خلا، قدرت کے کارخانے میں محال ہے۔ اور یہ صرف مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے اور اچھے نصب العین سے دست کش ہو جائے تو برے راستے اس کو خوش آتے ہیں ۔۔۔۔۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش، وہ موت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ یہ اقدار، قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ مسلم اقوام ہوں یا غیر مسلم، یہ اقدار کسی کے سامنے بھی نہیں۔ ان سب نے انہیں ترک کر دیا۔ اول الذکر مسئلہ صرف طوطی کا رہ گیا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلم اقوام میں سے ہر قوم ہی نہیں، ہر فرد اس کا مدعی ہے کہ قرآن پر اس کا ایمان ہے۔ تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مسلم اقوام نے بھی ان اقدار کو چھوڑ کر حیوانی (کافرانہ) زندگی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ یہ تو کھلا ہوا تضاد ہے! لیکن اس میں کوئی تضاد نہیں ۔۔۔

۱؎ ان حوالوں کے لئے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" دیکھئے۔

اصل یہ ہے کہ جسے ہم عام طور پر ایمان کہتے ہیں، وہ درحقیقت ایمان نہیں۔ لفظِ ایمان کا زبان سے ادا کر دینا ہے۔ قرآن کے الفاظ کو زبان سے دُہراتے رہنے کا نام ایمان رکھ لینا فریبِ نفس ہے۔ اور ہم سب

ایمان کسے کہتے ہیں؟

اسی فریبِ نفس میں مبتلا ہیں؂

آج کے رانجھے، آج کے مجنوں، سب لفظوں سے کھیلنے والے
بھول گئے محمل والے کو، وردِ زباں ہے "محمل محمل"

اس فریبِ نفس کے لئے ہم نے اپنی زبان میں ایک لفظ وضع کر رکھا ہے جو ہماری نگاہ کو حقیقت کی طرف آنے ہی نہیں دیتا۔ جس سے پوچھئے وہ کہہ دے گا کہ میں "خدا کو مانتا ہوں۔ خدا کی کتاب کو مانتا ہوں"۔ ہم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ اس "مانتا ہوں" کا مفہوم کیا ہے؟ غور کرنے پر نظر آجائے گا کہ یہ صرف دو لفظ ہیں جنہیں دہرا دیا جاتا ہے۔ درحقیقت ان سے مقصود و مطلوب کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ پر ایمان کے معنی ہیں اس کے احکام کی اطاعت کرنا۔ اور اس کی کتاب پر ایمان کا مطلب ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ جس ایمان کی شہادت انسان کا عمل نہیں دیتا، اس ایمان کا کچھ فائدہ نہیں۔ سورۂ انعام میں ہے کہ: لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا۔ (۶/۱۵۹) "جس شخص کے ایمان کے ساتھ عملِ خیر شامل نہیں ہوگا، اس کا ایمان اسے کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ (اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ کی بحث کا یہ موقع نہیں) اقبالؒ کے الفاظ میں ــــ مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل ــــ سمجھنے کی خاطر یوں کہئے کہ ایمان کیمسٹری کا ایک فارمولا ہے جس کے مطابق لیباریٹری میں عمل کر کے وہ نتیجہ پیدا کیا جائے گا جس کے لئے وہ فارمولا وضع اور مرتب ہوا تھا۔ اگر آپ اس فارمولا کو سنہری حروف میں لکھ کر حریر و اطلس کے جزدانوں میں لپیٹ رکھیں گے یا صبح شام اس کے الفاظ کو دہراتے رہیں گے، تو کیا اس سے وہ نتیجہ مرتب ہو جائے گا؟ قیامت تک نہیں ہوگا۔ دعویٔ ایمان بلا عمل کی یہی مثال سمجھئے۔ موجودہ مسلم اقوام کے دعوئے ایمان کی حالت کیا ہے، اس کے لئے مثالیں تو بہت سی دی جا سکتی ہیں لیکن میں یہاں صرف اس ایک مثال پر اکتفا کروں گا جو اس وقت ہم سب کے سامنے ہے اور جس نے ہمارے سینوں کو چھلنی کر رکھا ہے۔ سورۃ النساء کی یہ آیت کس مسلمان کے سامنے نہیں

قتلِ مومن

جس میں کہا گیا ہے کہ:۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا۔ (۴/۹۳)

جس مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اس کی لعنت۔ خدا نے اس کے لئے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ایک مسلمان کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان کے انفرادی قتل کو تو چھوڑیئے۔ جو کچھ آج مشرقِ وسطیٰ میں ہو رہا ہے اور جس میں مسلمان افراد ہی نہیں، مسلمان قومیں ایک دوسرے کے قتل میں مصروف ہیں۔ (اور ظاہر ہے کہ جنگ میں قتل بالارادہ ہوتا ہے) وہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان، باہمی قتال میں مصروف مسلمان قوموں کا قرآن مجید کی اس آیت پر ایمان ہے؟ میں کہتا ہوں کہ (سارے قرآن کو چھوڑیئے) اگر مسلمان اقوام کا قرآنِ مجید کی اس ایک آیت پر ہی ایمان ہوتا، تو ہماری تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا!

میں اپنے موضوع سے ذرا دُور ہٹ جاؤں گا لیکن جب بات سامنے آگئی ہے تو اس پر گفتگو کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ آیت آپ کے سامنے ہے۔ اس کا مطلب اور مفہوم اس قدر واضح ہے کہ اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں، مسلمانانِ عالم گزشتہ تمام صدیوں میں، ایک دوسرے کے خلاف مصروفِ قتال کیوں رہے ہیں؟ کیا ان کے دل میں ذرا سا بھی خدا کا خوف پیدا نہ ہوا؟ کیا وہ خدا کے غضب اور لعنت اور عذابِ عظیم کی طرف سے اس قدر نڈر ہو گئے کہ وہ ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں ایک دوسرے کو قتل کرتے، اور

سازش

اس پر فخر کرتے رہے اور کر رہے ہیں! اس کا جواب بڑا واضح ہے۔ یہ اس سازش کی وجہ سے ہوا جسے ہم اپنی تاریخ کے مقدس نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس تاریخ میں اس قسم کے افسانے وضع کر کے لکھ دیئے گئے کہ رسول اللہ کی وفات کے صرف پچیس چھبیس سال بعد، پوری کی پوری اُمت، جو صحابہؓ کبارؓ اور تابعینؒ پر مشتمل تھی، جنگِ جمل کے میدان میں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہو گئی، اور اس دن، بعض روایات کے مطابق دس ہزار، اور بعض کے مطابق تیس ہزار مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے جن میں اولوالعزم صحابہؓ بھی شامل تھے۔ پھر اس سے اگلے سال، باقی اُمت، صفین کے مقام پر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو گئی۔ (تاریخ کی رو سے) اس فوج میں ایک طرف، ستر اصحاب بدرؓ اور بیعتِ رضوان کی سعادت حاصل کردہ سات سو صحابہؓ اور چار سو کے قریب دیگر مہاجرین و انصار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ دوسری طرف بھی ایسی ہی صورت ہو گی۔ یہ سب وہ تھے جن کے متعلق خود خدا نے فرمایا تھا کہ: أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا۔ یہ سب پکے اور سچے، حقیقی مومن تھے۔ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (۸/۴) ان کے لئے عزت کا رزق اور مغفرت ہے۔ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ (۹/۱۰۰) اللہ نے ان کے لئے جنت تیار کر رکھی ہے۔ ہماری اس افسانوی تاریخ نے ان سب کو، ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں لا کھڑا کیا۔ اس جنگ میں روایات کی رو سے، قریب ستر ہزار مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ فرمایئے! تاریخ کی اس شہادت کے بعد، اس آیت کا کیا وزن اور اثر باقی رہ جائے گا جس میں کہا گیا ہے کہ جس نے کسی

ایک مسلمان کو بھی بالارادہ قتل کر دیا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے؟ یہ کہیں آنے والوں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ جب صحابہ کبارؓ اس آیت کی موجودگی میں، ایک دوسرے کو قتل کرتے رہنے اور بایں ہمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مستحق ٹھہرائے گئے، تو اگر ہم بھی انہی کے اتباع میں، ایک دوسرے کی گردن مار دیں تو کونسا جرم ہو گیا؟ اور پھر اس سازش کی کامیابی کا منظر ہے کہ جو شخص یہ کہہ دے کہ اس قسم کے واقعات وضعی افسانے ہیں جنہیں سازش کے تحت ہماری تاریخ میں شامل کر دیا گیا ہے، تو اس پر کفر کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں۔ جنہوں نے پہلے ایسا کہا تھا ان پر بھی کفر کے فتوے لگائے گئے تھے۔ جو آج ایسا کہتے ہیں ان پر بھی کفر کے فتوے لگتے ہیں۔ ایسا کرنے والے قرآن مجید کی اس آیت کو بھی مانتے ہیں، جس میں ان کا ایمان ہے اور اسے بھی صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ ان مسلمانوں نے (جن کے مومن حقا ہونے کی شہادت اور مستحق جنت ہونے کی بشارت خود خدا نے دی تھی) لاکھوں کی تعداد میں ایک دوسرے کو قتل کیا تھا۔ اسے کہتے ہیں کامیاب سازش!

تاریخ کو چھوڑیئے۔ آپ سوچئے کہ جو مسلمان قومیں آج جنگ کے میدانوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہی ہیں، کیا ان کے متعلق کہا جائے گا کہ ان کا قرآن مجید کی اس آیت پر ایمان ہے؟ (ضمناً) وہ مسلمان قومیں جو خود تو شریک جنگ نہیں، لیکن ان لڑنے والوں کا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ وہ بھی یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیں کہ ہمارا قرآن پر ایمان ہے۔ ہم قتال کے جرم کی مرتکب نہیں۔ ان کے متعلق بھی قرآن کریم میں ایک ارشاد موجود ہے اور وہ یہ کہ:

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا۔ (۴۹/۹)

اگر مسلمانوں کے کوئی دو گروہ باہمدگر نبرد آزما ہو جائیں تو تمہارا فریضہ ہے کہ تم آگے بڑھ کر ان میں صلح کرا دو۔

جو مسلمان قومیں، مشرقِ وسطیٰ کے اِن زلزلوں میں، مسلمانوں کے ہاتھوں دوسرے مسلمانوں کے قتل کو خاموش بیٹھے دیکھ رہی ہیں، انہیں سوچنا چاہیئے کہ کیا اُن کا قرآن مجید کی اس آیت پر ایمان ہے؟

عزیزانِ من! میں نے یہ مثالیں صرف یہ بتانے کے لئے پیش کی ہیں کہ یہ کہہ دینا کہ ہمارا قرآن کریم پر ایمان ہے اور عملاً اس کے خلاف چلنا، قرآن پر ایمان نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا آج، اقدارِ خداوندی کو پسِ پشت ڈال کر محض روٹی کے مسئلہ کو مقصدِ حیات قرار دینے والی مسلمان مملکتیں بھی اسی طوفان میں بہے جا رہی ہیں جس میں دنیا کی غیر مسلم اقوام وقفِ تلاطم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اور ہم سب اس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں جسے قرآن کریم نے اس نہجِ زندگی کا فطری نتیجہ قرار دیا تھا۔ جب تک ہم اقدارِ خداوندی کی اہمیت کو سرِ فہرست نہیں رکھتے، معاشرہ کی جن تباہ کن خرابیوں کا ہم رونا روتے رہتے ہیں، ان میں کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ جو جی میں

آتے کر کے دیکھ لیجئے ؎

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

غیر مسلم قومیں تو پھر جو کہہ سکتی ہیں، کہ ہمارے پاس وہ غیر متبدل اقدار نہیں۔ سوچئے کہ مسلمان قومیں اس باب میں کیا کہہ سکتی ہیں؟

استبدالِ قومی

اب میں، عزیزانِ من! ایک قدم آگے بڑھتا ہوں۔ قرآن کریم نے اُس قوم سے جو اقدارِ خداوندی سے اعراض برتنے، یہ کہا تھا کہ: وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم۔ (۴۷/۳۸) "اگر تم ان اقدار سے اسی طرح اعراض برتتے رہے، تو تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی"۔ یعنی ایسی قومیں جو ناقابلِ اصلاح حالت تک پہنچ چکی ہوں، ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی قوم جو ان سے بہتر ہوتی ہے، انہیں مصافِ زندگی سے الگ کر کے، ان کی جگہ لے لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اصلاحِ احوال کے اس پروگرام پر اُسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے جب دنیا میں ایسی قومیں موجود ہوں جو اقدار کی میزان میں دوسری قوموں سے بہتر ہوں۔ لیکن موجودہ دَور میں تو دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ اب تو دنیا کی کوئی قوم بھی ایسی نہیں جس کے ہاں اقدارِ خداوندی کا تصور غالب ہو اور وہ اس معیار کے مطابق دوسری اقوام سے بہتر ہوں۔ اس وقت تو کیفیت یہ ہے کہ:

نادر ہے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار
سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس

بلکہ اس سے بھی آگے —— یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری —— میں جب اس حقیقت پر غور کرتا ہوں تو بڑی گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ ان حالات میں، جبکہ استبدالِ قومی کا یہ پروگرام ناقابلِ عمل نظر آتا ہے، مشیتِ خداوندی نہ جانے نوعِ انسان کی نجات کے لئے اور کونسا طریق اختیار کرے؟ قرآنِ کریم میں ایک مقام پر یہ بھی آیا ہے۔ —— يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ۔ "اے نوعِ انسان اکان کھول کر سن لو کہ خدا تمہارا محتاج نہیں۔ تم اُس کے محتاج ہو۔ وہ قابلِ حمد و ستائش ذات، (تمام کائنات سے) مستغنی ہے۔ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ۔ " وہ اپنے قانونِ مشیّت کی رُو سے ایسا بھی کر سکتا ہے کہ تم سب کو لے جائے (فنا کر دے) اور تمہاری جگہ ایک نئی مخلوق لے آئے"۔ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ (۳۵/۱۵-۱۷) خدا کے لئے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ موجودہ نسلِ انسانی کو معدوم کر کے، کرۂ ارض پر کوئی نئی مخلوق بسا دے۔ اُس کے لئے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ لیکن قرائن، اور قرآنِ کریم کے دیگر مقامات سے مترشح ہوتا کہ اس سے موجودہ انسانوں کی جگہ کوئی دوسری مخلوق لے آنا مقصود نہیں بلکہ اسی نوعِ انسانی سے ایسے

افراد، گروہ یا قوم پیدا کر دیتا ہے جو سیرت و کردار کی رُو سے موجودہ اقوام سے مختلف ہوں ——
اوّل تو اس لئے کہ نسلِ آدم ابھی اپنی بھرپور جوانیوں تک پہنچی ہی نہیں۔ انسان بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہے جن میں سے ہنوز عشرِ عشیر کی بھی نمود نہیں ہوئی۔ علامہ اقبالؒ نے اس نکتہ کی تشریح مختلف انداز و اسلوب سے کی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:۔

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا — وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

دوسرے مقام پر ہے:۔

توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز — گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

انسان کا مستقبل

اور پھر ان کے وہ چار مصرعے جن میں انہوں نے اپنے مخصوص شوخ، دلآویز انداز میں حقائق کی ایک دنیا سمٹا کر رکھ دی ہے، انسان کے مستقبل کا بڑا حسین آئینہ ہیں۔ کہتے ہیں:۔

یکے در معنیٔ آدم نگر، از من چہ می پرسی — ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے — کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پُرخوں شود روزے

انسان کی ذات کے ارتقاء کی وسعتیں اور رفعتیں تو ایک طرف، مادی زندگی میں بھی اس کی قوتوں کی نمود کا ابھی ابھی آغاز ہوا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ:

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳)

اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے خدا نے تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے۔
یعنی انسان میں تسخیرِ کائنات کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ ابھی تو ان صلاحیتوں کی نمود کا آغاز ہی ہوا ہے۔ اس پروگرام کی تکمیل میں معلوم کتنے قرن درکار ہوں گے۔ باقی رہا اس کی ذات کا ارتقاء۔ سو اس کی وسعتوں کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

عرشِ معلیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں — گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا — اس کو میسر نہیں، سوز و گدازِ سجود

لہٰذا نوعِ انسان نے کرۂ ارض پر ابھی بے شمار منازل طے کرنی ہیں۔ ابھی تو قرآنی نظام کے متعلق وہ دور آنا ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ: لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹/۳۳) وہ نظام انسانوں کے تمام خودساختہ نظاموں پر غالب آ جائے گا —— یہ اُس زمانے میں ہو گا۔ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۳/۶)۔ جب عالمگیر انسانیت خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے اٹھ کھڑی ہو گی۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ (۳۹/۶۹) زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔ یہ يَوْمُ الدِّيْنِ ہو گا۔ یعنی قرآنی نظام کا دور جس کی خصوصیت یہ ہو گی کہ: يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا —— اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا دستِ نگر، محکوم، محتاج یا "ذلیل" نہیں ہو گا۔ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ

لِلّٰہِ ۔ (۱۹/۸۲) کیونکہ اُس وقت، جملہ امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی رو سے ہوں گے۔ یہ دور اسی کرۂ ارض پر، نوعِ انسان کے ہاتھوں رونما ہوگا۔ لہذا خدا کے پروگرام مشیّت کے مطابق ایسا نہیں ہوگا کہ اس سے پہلے انسان معدوم ہو جائے۔ جب تک قرآن موجود ہے، انسان معدوم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن نوعِ انسان ہی کی راہ نمائی کے لئے ہے۔ کیا خوبصورت انداز ہے کہنے والے کا جس نے کہا ہے کہ؎

از صدِ سخنِ پیرم، یک حرف مرا یاد است ۔۔۔ عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

لہذا (ہمارے علم کی موجودہ سطح کے مطابق) "یَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ" میں خلقِ جدید سے مراد انسانوں سے الگ، کوئی اور مخلوق نہیں۔ اسی انسان کا، اپنی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اور نمود اور اقدارِ خداوندی کے مطابق اپنی داخلی دنیا میں تغیر کی رو سے، "گویا نیا انسان" بن جانا مقصود ہے۔ لفظ خلق کے معنی "کثرتِ استعمال کے بعد کسی چیز کا صاف اور ہموار ہو جانا۔ اس میں صحیح تناسب اور اعتدال پیدا ہو جانا۔ اس کی مناسب ترتیب ہو جانا بھی" ہیں۔ اسی کو عادات و اطوار یا "خُلق" کہا جاتا ہے۔ اسی اعتبار سے حضورؐ نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا کہ: اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ (۴/۶۸) "اے رسول! یہ حقیقت ہے کہ تو خلقِ انسانی کے عظیم ترین مقام پر فائز ہے"۔ حضورؐ کی یہی زندگی ہے جسے نوعِ انسان کے لئے اُسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ (۲۱/۳۳) اسی اسوۂ حسنہ کے اتباع سے، اسفل سافلین (انسانیت کی پست ترین سطح پر پہنچا ہوا آج کا انسان) "احسنِ تقویم" کا درخشندہ پیکر بن جائے گا۔ (۴/۹۵) انہی افراد پر مشتمل وہ قوم ہوگی جو بگڑی ہوئی اقوامِ عالم کی جگہ لے گی۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے قوموں کی پرورش کے لئے بھی خَلق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ وَمِمَّنْ خَلَقْنَا اُمَّۃٌ یَّہْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِہٖ یَعْدِلُوْنَ۔ (۱۸۱/۷) "وہ لوگ جنہیں ہم نے ایسی قوم بنایا ہے جو لوگوں کی راہنمائی الحق (وحی خداوندی) کے مطابق کرتی ہے اور اسی کی رو سے ان کے اختلافی معاملات کا فیصلہ کرتی ہے"۔ یہی انسان کی وہ خلقِ جدید ہے جسے اقبالؒ آدمِ نو کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ؎

نقشِ دگر طراز دہ، آدمِ پختہ تر بیار ۔۔۔ لعبتِ خاک ساختن می نسزد خدائے را

بلکہ اس سے بھی شوخ تر الفاظ ہیں کہ؎

ہے نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل ۔۔۔ کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

انہیں اسی آدمِ نو کی نمود کے کچھ کچھ آثار، مفکرینِ مغرب کے افکار و تخیلات میں دکھائی دینے لگے۔ جس کا اظہار انہوں نے پیامِ مشرق کے دیباچہ میں ان الفاظ میں کیا تھا۔

یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرتِ زندگی کی

آدمِ نو کی تخلیق گویا انہوں نے ایک نیا آدم، اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر دی ہے جس کا دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے۔

آئن سٹائن کے مقابلہ میں، برگساں نے اس موضوع پر زیادہ وضاحت سے لکھا ہے۔ وہ اپنی آخری تصنیف (THE TWO SOURCES OF MORALITY AND RELIGION) میں لکھتا ہے :۔

> آج نوعِ انسان، خود اپنی ترقی کے بوجھ کے نیچے دبی کچلی ہوئی مصروفِ آہ و فغاں ہے۔ یہ اس لئے کہ انسان کو اس کا احساس نہیں کہ اس کا مستقبل خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ انسان زندہ رہنا چاہتا ہے یا نہیں؟ پھر اس کے بعد یہ کہ انسان محض زندہ ہی رہنا چاہتا ہے یا اس سے آگے بڑھ کر، فریضۂ کائنات کی تکمیل کے لئے بھی جد و جہد کرنے کو تیار ہے۔ فریضۂ کائنات کیا ہے؟ خدائی صفات کے حامل افراد کی تخلیق۔ (ص ۳۰۶)

آپ اس اقتباس کے آخری الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے۔ یعنی فریضۂ کائنات کیا ہے؟ "خدائی صفات کے حامل افراد کی تخلیق" کیا یہ قرآنِ کریم کی اس آیت کا گویا ترجمہ نہیں۔ جس میں کہا گیا ہے کہ :۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔ (۲/۱۳۸) "خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے انسان کہ جس رنگ سے زیادہ حسین کوئی رنگ نہیں"

جیسا کہ میں نے متعدد بار کہا ہے، انسان کے ہر تجربہ کی ناکامی، اس کی فکر کا رُخ اُس سمت کی طرف موڑ دیتی ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے۔ قومیں خواہ کتنی ہی بگڑ چکی ہوں، ان میں ایسے افراد ضرور ہوتے ہیں جو زندگی کے حقائق اور صداقت کے متلاشی ہوں۔ اور یہ حقائق اور صداقت قرآن مجید کے سوا کہیں موجود نہیں۔ لہٰذا کوئی زمانہ بھی اس قسم کے افراد سے خالی نہیں ہوتا۔ قرآن زندہ حقائق کا ضابطہ ہے۔ اگر ان حقائق کی جستجو اور تڑپ کہیں نہ رہے تو دنیا میں قرآن کی موجودگی بے معنی ہو جائے۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔

وا دیوں گے، مگر تیری تمنا نہ رہے گی ؛ یہ وقت جب آئے گا، تو دنیا نہ رہے گی

آج ذرائع معلومات کے عام ہو جانے کی وجہ سے، اس قسم کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ فکری رابطہ پیدا کر رہے ہیں جس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک دن ایک گروپ کی شکل اختیار کر لیں گے۔ یہ سوچ والا گروپ، جو باقی انسانوں پر تیزی کے ساتھ اثر انداز ہو گا۔ روسی مفکر اوسپنسکی کے استاد (یا گرو) گرجیئف کے الفاظ ہیں :۔

> انسانیت کا ارتقا ایک مخصوص گروہ کی وساطت سے ہی عمل میں آ سکتا ہے۔

یہ گروپ باقی نوعِ انسانی پر انحصار ہوگا اور اس کی راہ نمائی کرے گا۔

(ALL AND EVERYTHING. P. 309)

بات یہاں سے چلی تھی کہ اس وقت دنیا میں کوئی قوم بھی ایسی نہیں جو قرآن کے معیار کے مطابق، باقی اقوام سے بہتر ہو۔ اس لئے استبدالِ قومی کا طریق تو ان حالات میں ممکن العمل نہیں۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ اس کے لئے دوسرا طریق یہ ہے کہ انہی اقوام میں سے، انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے متمنی افراد اپنی جماعت متشکل کریں گے جو موجودہ اقوام سے بہتر ہوگی۔ یہ جماعت ایک اُمت کی شکل اختیار کر لے گی اور غلط رو قوموں کی جگہ لے لے گی۔ یہی وہ طریق تھا جس کے مطابق، صدرِ اوّل میں اصلاحِ انسانیت کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ ظہورِ نبوی کے وقت بھی دنیا میں کوئی ایسی قوم موجود نہیں تھی جو قرآنی معیار کے مطابق اپنی ہمعصر اقوام سے بہتر ہو۔ لیکن ایسے افراد موجود تھے جن میں تلاشِ حقیقت کی تڑپ تھی لیکن صحیح راستہ ان کے سامنے نہیں تھا، انہیں صحیح راستہ دکھایا گیا تو وہ بکھرے ہوئے افراد، نسل۔ رنگ۔ زبان۔ وطن کی حدود و قیود سے بلند ہو کر، ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ اس طرح وہ امت وجود میں آ گئی جسے اُمتِ وسطیٰ یا خیر اُمتہ کہہ کر پکارا گیا اور اس نے باقی انسانوں کی زندگی پر اثر ڈالا اور اس طرح ان کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کی۔ یہ اُس دور کے "آدمِ نو" تھے ——— باقی نسلِ انسانی سے یکسر مختلف، اگرچہ طبیعی اعتبار سے بشرٌ مثلھم۔ مجھے کچھ ایسا نظر آ رہا ہے کہ موجودہ حالات میں، ایک نئی قوم پیدا کرنے کا وہی طریق پھر کارفرما ہوگا، اس فرق کے ساتھ کہ اُس زمانے میں وہ مرکز، رسُول اللہ کی ذاتِ گرامی تھی لیکن اب اس مرکزیت کے لئے کوئی رسولؐ یا مامور من اللہ نہیں ہوگا۔ ختمِ نبوت نے ماموریت من اللہ کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اب یہ افراد، باہمی مشاورت سے اپنی مرکزیت آپ قائم کریں گے۔ انسانی شعور اب اتنا بالغ ہو چکا ہے کہ اگر اسے صحیح راستہ مل گیا تو پھر وہ غلط موڑ نہیں مڑے گا۔ لہٰذا اب، کائنات کا یہ بگڑا ہوا نقشہ، قرآنی راہ نمائی کی روشنی میں عام انسانوں ہی کے ہاتھوں صحیح خطوط پر مرتب ہوگا۔ اس کے لئے کسی مامور من اللہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ پولینڈ کے فلاسفر (BERDYAEV) نے اس حقیقت کو اپنے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:-

> یہ دنیا ممکنات کی دنیا ہے۔ یہ مکمل شدہ جامد و ساکت نہیں، اس میں عملِ تخلیق جاری رہے گا، اور خود انسانوں کے ہاتھوں جاری رہے گا۔ اب انسان کو اپنی ممکنات سے خود پردہ کشائی کرنی ہوگی اور ہر مضمر کو مشہود کر کے دکھانا ہوگا۔ یہ عملِ تخلیق خدا کی طرف سے انسانوں کی طرف ہی نہیں آتا بلکہ خدا خود انسانوں سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادی کا منتظر رہتا ہے۔ (THE DIVINE AND THE HUMAN. P. 53)

ختمِ نبوت سے یہی مقصود تھا، یعنی، قرآنِ کریم کے الفاظ میں، ان زنجیروں کو توڑ کر جن میں انسان جکڑا ہوا چلا آرہا تھا، اور ان کے سر پر سے ان سلوں کو اتار کر جن کے بوجھ تلے وہ کچلا جا رہا تھا، اسے وہ آزادی عطا کر دینا جس سے وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی پوری طرح نشو و نما کرنے کے قابل ہو سکے۔ یہی وہ آزادی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

قرآن کے الفاظ میں: وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ۔ (۷/۱۷۶) ہم تو چاہتے تھے کہ اسے، قرآن کے ذریعے آسمان کی بلندیوں کی طرف لے جائیں، لیکن یہ اپنے پست جذبات کے پیچھے لگ کر، زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس نَشْاَۃِ ثَانِیَہ۔ اس خلقِ جدید سے انسان اپنی حیوانی زندگی کی خاکی پیوندی سے دامن چھڑا کر شرفِ انسانی کی رفعتوں کی طرف گامزن ہو جائے گا۔ قرآن کے باقی اور محفوظ رکھنے سے یہی مقصود تھا۔

ابلیس کا چیلنج

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس قسم کے افراد ہر زمانے میں موجود رہتے ہیں۔ ابلیس نے جب خدا کو چیلنج دیا تھا کہ تو نے آدم کو مجھ پر فضیلت تو دے دی ہے لیکن تو دیکھ کہ میں اولادِ آدم کو کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ تو اس کے جواب میں کہا گیا تھا کہ جو تیرے جی میں آئے کر دیکھ۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ (۱۵/۴۲) میرے بندوں پر تیرا غلبہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ اس "دام و دد" سے معمور کرۂ ارض کے جنگل میں، یہ "عبادی" ہی وہ سعادت بخت انسان ہیں جنہیں ہم نے "آدم تو" سے تعبیر کیا ہے۔ رومی نے اسی قسم کے انسانوں کی تلاش کی جد و جہد کو اس قدر بلیغ اور دلآویز پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ اقبالؒ نے ان اشعار کو، اپنی پہلی تصنیف، اسرارِ خودی کے سرنامہ کے طور پر درج کیا ہے۔ رومی نے کہا ہے کہ:-

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست!

گفتم کہ یافت می نشود، جستہ ایم ما!

گفت آنکہ یافت می نشود، آنم آرزوست

انہی کی تلاش میں خود اقبالؒ بھی عمر بھر مصروفِ تگ و تاز و مشغولِ نے نوازی رہا۔

غزل سرائیم و پیغامِ آشنا گوئیم بایں بہانہ دریں بزم محرمے جوئیم

تلاشِ صادق شرط ہے، ڈھونڈنے والے کو یہ افراد مل سکتے ہیں۔ عالمگیر فساد کے زمانے ہیں، ان افراد کے ربطِ باہمی، اور مناسب تعلیم و تربیت کے لئے، داستانِ بنی اسرائیل میں ہمیں ایک اشارہ ملتا ہے۔ جب وہ فرعونی استبداد کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مصر میں غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے

اور حضرت موسیٰؑ وہاں پیغامِ انقلاب لے کر پہنچے تو آپ سے کہا گیا کہ، وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً (۱۰/۸۷) "ان سے کہو کہ تم اپنے گھروں کو قبلہ بنا لو۔ اور وہاں اپنی تربیت شروع کردو" ابتداءِ کار کے لئے یہ چھوٹا سا گروہ، وہ ذرۂ اولین (FIRST CRYSTAL) بن جائے گا جس کے گرد اسی قسم کے دیگر افراد مرتکز ہوتے جائیں گے۔ ان میں نصب العین کی وحدت، وجہِ پیوستگی (CONCENTRATING FORCE) ہوگی۔ اس قسم کے گروپ کے متعلق (BRIGHTMAN) لکھتا ہے کہ:

> یہ ان آزاد لوگوں پر مشتمل ہوگا جو ایک معقول اور قابلِ قدر نصب العین کے حصول کے لئے باہمی تعاون و تناصر سے کام لیں۔ وہ نصب العین جس کی بنیادیں خدا کے ایمان پر استوار ہوں۔
>
> (A PHILOSOPHY OF RELIGION)

قرآن کریم انہی افراد کے متعلق کہتا ہے:

> يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا۔ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۳/۱۹۹)
>
> اے وہ لوگو! جو وحدتِ نصب العین کی صداقت پر یقین رکھتے ہو، اگر تم اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ تم میں سے ہر فرد خود بھی ثابت قدم اور مستحکم رہے اور دوسروں کے لئے بھی اسی قسم کے ثبات و استحکام کا ذریعہ بنے۔ اور اس طرح تم سب ربطِ باہمی سے جادۂ ہدایتِ خداوندی پر گامزن رہتے ہوئے آگے بڑھتے جاؤ۔

تحریکِ طلوعِ اسلام

تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد، عزیزانِ من! اسی قسم کے منتشر افراد کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے۔ وہ افراد جنہیں یہ یقینِ محکم حاصل ہو کہ انسانی مشکلات کا حل قرآن مجید کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ اب میرا روئے سخن بالخصوص ان احباب کی طرف ہے جو اس مقصد کو دل میں لئے اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں، اور اب اس غرض کے لئے اس اجتماع میں شریک ہوئے ہیں کہ اس تحریک کے فروغ اور اس مقصد کے حصول کے لئے کیا کچھ مزید کیا جائے۔ یہ جذبہ بڑا مبارک اور اس قسم کی کوششیں بڑی مستحسن ہیں۔ لیکن میں اس سلسلہ میں ایک وارننگ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ قرآن کریم، محض فکری وحدت کو کافی قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک حقیقی وحدت وہ ہے جو قلوب کی ہم آہنگی سے پیدا ہو۔ جو شخص نظری طور پر اس مقصد کو صحیح سمجھ کر اپنے آپ کو اس رشتہ میں منسلک کرلے گا وہ اس گروپ میں شامل تو ہو جائے گا لیکن صرف اتنے سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکے گی جسے قرآن أَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ (۳/۱۰۲) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی دلوں کا آپس میں جڑ جانا ——

اور ایسا ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ کی فکر، آپ کے احساسات و جذبات کو متاثر اور متحرک نہ کرے۔ یاد رکھئیے! تنہا فکر، عمل کی محرک نہیں ہو سکتی۔ عمل کے محرک، جذبات و احساسات

وحدتِ قلبی

ہوتے ہیں۔ جب مختلف افراد کے جذبات، ایک جیسی فکر سے متاثر ہوں گے، تو ان میں وحدتِ کردار و عمل پیدا ہوگی۔ اسی لئے اقبال نے کہا تھا کہ ——

وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام —— اس قرآنی حقیقت کی اہمیت کو اب مغربی مفکرین بھی سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے ان کا سارا زور فکری ہم آہنگی پر ہوتا تھا۔ عصرِ حاضر کے مشہور مؤرخ تہذیب (J. H. DENISON) نے ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے —— (EMOTION AS THE BASIS OF CIVILISATION) —— اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر نے اپنے چھٹے خطبہ کے شروع اس کتاب کا ایک طویل اقتباس دیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں (GEORGE FOOT MOORE) لکھتا ہے:-

> تہذیب کا نشو و نما اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کسی مقصد کے حصول کے لئے جد و جہد کرے۔ اس قسم کا اتحاد، تنہا وحدتِ فکر کی بنا پر ممکن نہیں ہوتا۔ یہ اتحاد وحدتِ جذبات و احساسات سے ممکن ہوتا ہے جس سے انسانی فکر میں جذباتی تحرک پیدا ہوتا ہے اور وہ معتقدات اور مقاصد بن جاتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ ہم میں (یعنی جنہوں نے اس تحریک سے وابستگی اختیار کی ہے ان میں) قدر مشترک یا وجہِ پیوستگی فکری وحدت ہے، اور ہماری غلط نگہی یہ کہ ہم نے اسی کو کافی سمجھ لیا ہے۔ ہم میں جذبات و احساسات کی وحدت پیدا نہیں ہوئی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں بھی (دوسرے لوگوں کی طرح) اکثر باہمی تنازعات اُبھرتی رہتی ہیں، حالانکہ جذباتی وحدت میں کسی قسم کی نزاع کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ یہ جو قرآنِ کریم نے مومنین کی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ —— بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ۔ (۹/۷۱) وہ ایک دوسرے کے جگری دوست ہوتے ہیں، تو اس قسم کے تعلقات جذباتی وحدت کے بغیر ممکن نہیں۔ محض فکری وحدت سے آپ میں، گھڑی کے پرزوں کی طرح، میکانکی تعاون تو پیدا ہو جائے گا۔ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ کی کیفیت پیدا نہیں ہوگی۔ گھڑی کے پرزے ساری عمر محوِ گردش رہتے ہیں لیکن رہتے ہیں ویسے کے ویسے ہی۔ بلکہ وہ گھس کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ارتقاء پیدا نہیں ہوتا۔ فکری وحدت زیادہ سے زیادہ اسی قسم کے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ انسان کی داخلی دنیا میں تغیر پیدا نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ فکری اشتراک کے باوجود باہمی نزاعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ باہمی نزاع کی وجہ کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق مشہور روسی مفکر، اوسپنسکی لکھتا ہے کہ:-

> انسانوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلط فہمیاں اس لئے پیدا ہو جاتی ہیں

کہ وہ مختلف جذبات کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر ان کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو وہ ایک دوسرے کو بالکل صحیح طور پر سمجھنے لگ جائیں

(TERTIUM ORGANUM · P. 200)

جذباتی وحدت

وہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں لکھتا ہے کہ آپ دیکھئے۔ شراب پینے والے ایک دوسرے کے یار ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ شراب ان میں ایک جیسے جذبات پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح بھنگ پینے والے ایک دوسرے [illegible] ہوتے ہیں کیونکہ برگِ حشیش ان سب کو ایک ہی قسم کے افلاک کی سیر کراتی ہے۔ لیکن شراب یا بھنگ کے نشے، ایک تو عارضی ہوتے ہیں، اور دوسرے ان میں، انسانی فکر معطل اور مسلوب ہو جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ جب ان کا نشہ اتر جاتا ہے تو وہ پھر حسبِ سابق ایک دوسرے کے دشمن یا مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم، جن جذبات کو وحدتِ فکر کی بنا پر ہم آہنگ کرتا ہے، ان میں یہ نقص نہیں ہوتا —— نہ وہ عارضی ہوتے ہیں، اور نہ ہی ان میں فکر مسلوب یا معطل ہوتی ہے۔ بلکہ وہ فکر کو اور جلا دیتے ہیں۔ جن خوش بخت افراد میں اس قسم کی فکری اور جذباتی وحدت پیدا ہو جاتی ہے، قرآن مجید، ان کی زندگی کو جنتی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس جنتی معاشرہ میں داخل ہونے والوں کی اوّلین خصوصیت یہ ہوگی کہ: وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ۔ (7/43) ان کے دلوں سے غِلّ نکال دیا جائے گا۔ یہ لفظ (غِلّ) ہے تو بہت چھوٹا سا لیکن معانی اور مفہوم کے اعتبار سے یہ بہت وسیع ہے۔ بات سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ اس کے دل میں میرے خلاف گرہ بیٹھ گئی ہے جو نکلنے میں ہی نہیں آتی۔ غِلّ کے بنیادی معنی اسی قسم کی گرہ سمجھ لیجئے۔ اور اس گرہ سے ایک دوسرے کے خلاف،

جنتی زندگی

کینہ، کدورت، حسد، انتقام، عداوت کی جو زہر آلود خواہشیں پیدا ہوتی ہیں، ان سب کو اس میں شامل کر لیجئے۔ یہ ہے مفہوم غِلّ سے۔ جنتی معاشرہ کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والے افراد کے دلوں میں کوئی غِل نہیں ہوگا۔ اسے جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی دور کر دیا جائے گا۔ یہ گرہیں کھول دی جائیں گی —— اسی کیفیت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ۔ (15/47) اس کا عام ترجمہ تو یہی ہے کہ "وہ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی طرح بیٹھیں گے"۔ لیکن لفظ سُرُر کا مادہ (س-ر-ر) ہے جس کے بنیادی معنی راز کے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے (FACE TO FACE) وہی بیٹھ سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی راز کی بات نہ ہو۔ يُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا۔ (25/75) وہ جب ایک دوسرے کو ملیں گے تو زندگی بخش سلامتی کی آرزوؤں کے ساتھ ایک دوسرے کو خوش آمدید کہیں گے۔ یہ وہ جنتی معاشرہ ہوگا جو

قرآنی رشتہ پر مشتمل ہوگا۔ اس کے برعکس، جہنمی معاشرہ میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: لَا مَرْحَبًا بِہِمْ (۳۸/۵۹) وہ منافقت اور ریاکاری سے ایک دوسرے سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں لیکن دل سے کبھی خوش آمدید نہیں کہتے۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر کبھی خوش نہیں ہوتے اس لئے کہ ان کے دلوں میں غِلّ بھرا ہوتا ہے۔

اس غِلّ کے نکالنے میں عزیزانِ من! ایک اور بھی عمیق نکتہ مضمر ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، غِلّ کے معنی ہیں دل میں پڑی ہوئی گرہ۔ اور انتزاع کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اکھیڑ کر یا کھینچ کر نکالنا۔ جیسے پھانس نکال دی جائے۔ دورِ حاضر کے جہنمی معاشرہ میں اعصابی بیماریاں عام ہیں۔ ان سے جو اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمارا شب و روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ان کیفیات کو جسمانی امراض قرار دے کر ان کے بیسیوں علاج سوچے گئے لیکن ان میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ اب ماہرینِ علم النفس (PSYCHOLOGISTS) اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جسمانی امراض ہیں ہی نہیں۔ انسان کے تحت الشعور میں کوئی ایسا راز پیوست ہو جاتا ہے جسے اس کا شعور فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ گہرائی میں یا چھپا ہوا یہ راز پھانس کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے ——— پھانس ہوتی تو کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن اس کی پیدا کردہ بے چینی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ انسان کو عمر بھر کے لئے چین نہیں لینے دیتی۔ اب ان، تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کا علاج، تجزیہ نفس کی رو سے کیا جاتا ہے۔ اس فن کا ماہر کرتا یہ ہے کہ مریض کے تحت الشعور میں چھپے ہوئے راز کو کسی نہ کسی طرح کھینچ کر باہر لے آتا ہے اور مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ (بالخصوص امریکہ) میں اب یہ طریقِ علاج زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اعصابی مریض وہاں بھی زیادہ ہیں۔ ایسا کس کس طریق سے کیا جاتا ہے، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن ان سب میں ایک قدرِ مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مریض کا اپنے معالج پر کلی اعتماد ہونا چاہیئے۔ یہی اعتماد ہے جس کی بنا پر، یہ معالج اس پھانس کو باہر نکال لیتا ہے۔

اس کے بعد پھر آیئے قرآنِ کریم کی اس آیۂ جلیلہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ: وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ ۔ (۷/۴۳) ان کے تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کو نکال باہر کیا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جنتی معاشرہ کے افراد میں باہمی اعتماد کی کیفیت یہ ہوگی کہ شعوری راز تو ایک طرف، تحت الشعور میں جاگزیں سترِ مستور بھی ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ یہ کیفیت ہوگی ان کے شرحِ صدر کی۔

عزیزانِ من! اگر آپ کے باہمی تعلقات کی کیفیت ایسی ہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ یہ تعلقات قرآنی ضابطہ سے استوار ہیں۔ اگر ایسی کیفیت نہیں تو آپ کا ربطِ باہمی محض فطری اور میکانکی ہے۔ اس سے میکانکی نتائج تو مرتب ہو سکتے ہیں۔ قلب و نظر میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

آپ ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ آپ جو قرآنی رابطہ کی بنا پر ایک گروپ بننے کے مدعی ہیں، آپ کا یہ رابطہ کس زمرے میں آتا ہے! — قلبی یا محض میکانکی؟

مجھے اس کا علم و احساس ہے کہ آپ احباب جو فکری طور پر اس تنظیم سے وابستہ ہوئے ہیں، تو آپ نے تقلیداً ایسا نہیں کیا۔ آپ نے پورے غور و خوض کے بعد اپنی سابقہ (غلط) روشوں کو چھوڑ کر علیٰ وجہ البصیرت اس راستے کو اختیار کیا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ آپ کا ہر قدم یہ آواز دیتا ہے کہ: ؎

حرم کو چھوڑ کے پیرِ حرم کہاں جاؤں کہ میں تو دیر و کلیسا سے ہو کے آیا ہوں

اس کے باوجود یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ اس فکری رابطہ سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں۔ یہ بھی دیکھیں کہ آپ کی سیرت و کردار میں وہ تبدیلی پیدا ہوئی ہے یا نہیں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اگر آپ کے قلوب ایک دوسرے سے جڑ گئے ہیں تو پھر سمجھئے کہ قرآنی رابطہ کا مقصد پورا ہوا ہے، ورنہ نہیں — لیکن اس کے بعد بھی آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ آپ باقی مسلمانوں سے الگ کوئی ممتاز افراد بن گئے ہیں۔ یاد رکھئے۔ اپنے آپ کو "حقیقی" اور دوسروں کو "پیدائشی" مسلمان سمجھنا۔ یا اپنے آپ کو صالح اور باقی مسلمانوں کو غیر صالح قرار دینا، انانیت کے نفسیاتی مرض کا مظہر ہے جو احساسِ کمتری سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ: فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ۔ (۵۳/۳۲) "اپنے آپ کو یونہی مزکّی نہ سمجھ لیا کرو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اپنے آپ کو پستیوں میں گرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔" اللہ تعالیٰ آپ کو ایسی قسم کے وساوس سے محفوظ رکھے۔ آپ کی سیرت و کردار کو ایسا ہونا چاہیئے جس سے دنیا خود اندازہ لگا لے کہ آپ کیسے ہیں۔

فرقہ بندی نہیں

آپ کی اس تحریک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ بغیر فرقہ بنائے دین کی طرف دعوت دیتی ہے۔ یہ انداز سرسید (علیہ الرحمتہ) نے اختیار کیا تھا۔ انہوں نے بھی فرقہ بندی کو خلافِ اسلام قرار دے کر اپنا کوئی فرقہ نہیں بنایا تھا۔ لیکن فرقہ پرست اسے کیسے برداشت کر سکتے تھے! وہ جو مشہور ہے کہ کسی نے کبڑی سے پوچھا کہ تمہارا کُب دور ہو جائے یا سب کبڑے ہو جائیں، تو اس نے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ سب کبڑے ہو جائیں۔ یہی حالت ہمارے فرقہ پرستوں کی ہے۔ سرسیدؒ نے ہزار چاہا کہ ان کبڑوں کا کُب ٹھیک ہو جائے لیکن انہوں نے نہ مانا، اور اسے بھی کبڑا بنا کر چھوڑا۔ سرسیدؒ نے قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کے مطالعہ اور مشاہدہ پر زور دیا تھا۔ انہوں نے اسے "نیچری" کہنا شروع کر دیا۔ اور اس سے نیچریوں کا ایک فرقہ بنا دیا۔ اور خوش ہو گئے کہ ہم نے انہیں بھی اپنے جیسا بنا دیا ہے۔ ان لوگوں نے یہی ٹیکنیک آپ کی

تحریک کے سلسلہ میں بھی اختیار کی ہے۔ ہمارے ہاں فرقوں کی باہمی سرپھٹول صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ ایک روایت کا حوالہ دے کر (جس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ بنی اسرائیل میں بہتّر فرقے تھے۔ میری اُمت میں تہتّر فرقے ہوں گے جن میں سے ایک فرقہ ناجی ہوگا اور باقی سب جہنمی) ہر ایک فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسرے فرقوں کو جہنمی ثابت کرنے کے جہاد میں مصروف رہتا تھا۔ طلوعِ اسلام نے پہلی بار یہ آواز بلند کی کہ قرآنِ کریم کی رُو سے خود فرقہ سازی شرک ہے۔ اس میں اِس فرقے یا اُس فرقے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے اسے قرآن مجید کی نصوصِ صریحہ کی سند کے ساتھ کہا۔ (دیکھئے $\frac{۳}{۳۱-۳۲}$) اس کا جواب اِن کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ انہیں بھی ایک فرقہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عالمِ خیال میں ایک فرقے کا وجود تخلیق کیا اور اسے پرویزی فرقہ کے نام سے مشہور کر دیا۔ اس فرقے کا وجود خارج میں کہیں نہیں۔ صرف ان کے ذہنوں میں محبوس ہے اور ان کے جھوٹے پروپیگنڈہ کی رو سے مشہور۔ جو لوگ تحریک طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر سے متاثر یا اس سے وابستہ ہیں، ان کی نہ کوئی الگ مسجد ہے۔ نہ وہ دوسروں سے مختلف کوئی اپنی نماز پڑھتے ہیں۔ نہ ان کے پرسنل لاز علیحدہ ہیں۔ وہ ان تمام امور میں امت کے ساتھ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، ہر محراب و منبر سے پرویزی فرقہ، کا چرچا کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے بانی، مودودی صاحب نے جو یہ ارشاد فرما دیا کہ زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں بلکہ شرعاً واجب ہو جاتا ہے، تو اس نے "خدا پرستوں" کے لئے کذب و افترا کے سب دروازے چوپٹ کھول دیئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب، اپنے مخالفین کے خلاف، "خدا اور رسول" کے نام پر، ہر قسم کے جھوٹے الزامات تراشے جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اس کذب بافی پر کسی قسم کی ندامت ہو، اس پر فخر کیا جاتا ہے۔ لیکن عزیزانِ من! اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ اس دنیا میں یہ خدائی فوجدار، دوسروں کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرنے کے لئے لاکھ مسندِ عدالت پر اپنے آپ کو فائز سمجھ لیں۔ عدالتِ خداوندی میں تو یہ سب، دوسروں کے ساتھ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے۔ وہاں اگر اس "خطاکار" سے سوال ہوگا کہ تم "حسبنا کتاب اللہ" کہتے تھے تو بصد احترام عرض کروں گا کہ ہاں حضور! کہتا تھا ــــــ اور عمر بھر کہتا رہا!

وفا خطا تھی، خطا میں نے زندگی بھر کی اب اس کے آگے جو مرضی ہو بندہ پرور کی!

لیکن آپ یہ دیکھئے، رفیقانِ گرامی قدر! کہ ان لوگوں کی طرف سے اس قدر بے پناہ مخالفت، اور آپ کی اس قدر بے سروسامانی کے باوجود، آپ کے مشن کو کامیابی کس قدر ہوئی ہے؟ آپ، تیس سال پہلے کی مذہبی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے۔ اور جن احباب کی عمر زیادہ ہے، وہ اُس زمانے کے وعظوں اور خطبوں کی یاد تازہ کریں۔ آپ کو ان میں، اور تو سب کچھ ملے گا، لیکن قرآن کا نام کہیں نظر

نہیں آئے گا۔ لیکن آج کیفیت یہ ہے کہ نہ کوئی مذہبی رسالہ ایسا ملے گا نہ کوئی کتاب جس میں قرآن کا نام نہ لیا گیا ہو۔ نہ کوئی محراب و منبر ایسا ہے جہاں اپنی بات کے ساتھ قرآن کی آیت نہ ضم کی جاتی ہو، اور نہ ہی کوئی اسٹیج جہاں اپنے دعوے کی نسبت اس کتاب کی طرف نہ کی جاتی ہو۔ خواہ وہ نسبت یا دلیل غلط ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ اب تو دبستانِ حکومت اور ایوانِ پارلیمان تک میں اس کے تذکرے سنائی دینے لگے ہیں۔ سوچئے کہ اتنی بڑی تبدیلی کس کی نواگری کا صدقہ ہے۔ آپ بے نواؤں کی والہانہ کاوشوں کا! اس تبدیلی کی اس سے بھی زیادہ دلچسپ مثال ملاحظہ کیجئے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، ہمارے ہاں ہزار برس سے مذہبی فرقے چلے آ رہے تھے۔ طلوعِ اسلام نے جو نصوصِ قرآنی کی رو سے بتایا کہ فرقہ بندی شرک ہے تو اس کا کوئی جواب ان سے بن نہ پڑا۔ لیکن آپ کی اس بیباکانہ حق گوئی کا اثر یہ ہوا کہ یہ حضرات اپنے آپ کو فرقہ کہنے سے شرمانے لگے۔ چنانچہ اب ان کی طرف سے یہ آواز بلند ہونی شروع ہوگئی ہے کہ یہ فرقے نہیں، مکاتبِ فکر ہیں۔ ہر چند ان کی یہ خود فریبی یا فریب دہی، کھسیانی بلی کے کھمبا نوچنے کے مترادف ہے، لیکن اس سے اتنا تو واضح ہے کہ آپ کی اس پکار سے یہ اپنے آپ کو فرقہ کہنے سے جھینپنے لگے ہیں۔ یہ ہیں آپ کی دعوت الی القرآن کے وہ نتائج جو غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کے (یا بالفاظِ صحیح یوں کہئے کہ آپ کی قرآنی آواز کے) خلاف پھیلائی ہوئی تاریکیاں بظاہر بڑی دبیز اور وحشت انگیز نظر آتی ہیں، لیکن آپ کو ان کا کوئی اثر نہیں لینا چاہیئے۔ جھوٹ کے تو پاؤں ہوتے ہی نہیں۔ اس لئے ؎

ظلمتِ شام سے اندازۂ انجام نہ کر! رات کی رات میں انجام بدل سکتا ہے

اس کے بعد دو ایک ضروری تنبیہات۔ میں نے آپ سے ایک بار کہا تھا کہ آپ کی صفوں میں ایسے لوگ گھستے چلے جا رہے ہیں جو قرآن کے نام سے خلافِ قرآن خیالات پھیلاتے رہتے اور انہیں منسوب آپ کی طرف کرتے رہتے ہیں۔ میں نے متنبہ کیا تھا کہ آپ احباب ان سے خاص طور پر محتاط رہیں اور انہیں اپنے قریب نہ آنے دیں۔ اب انہوں نے ایک اور انداز اختیار کیا ہے۔ مجھے اکثر ایسے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں، جن میں لکھا ہوتا ہے کہ میں ایک عرصہ سے طلوعِ اسلام۔ ترجمان القرآن یا بلاغ القرآن وغیرہ رسائل کا مطالعہ کرتا چلا آ رہا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ سب کی دعوت ایک ہی ہے۔ تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ان کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ میں جواب میں یہ کہا کرتا ہوں کہ اگر آپ واقعی نیک نیتی سے ایسا سمجھتے ہیں تو میرا آپ سے مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ جو جی میں آئے پڑھیئے لیکن طلوعِ اسلام کا مطالعہ کرنے میں اپنا وقت، توانائی اور پیسہ ضائع نہ کریں۔ آپ کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں کہ آپ طلوعِ اسلام کی دعوت کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اس میں اور مذہبی رسالوں کی دعوت میں فرق کر سکیں۔ میری آپ احباب سے درخواست ہے کہ اگر آپ اپنی صفوں میں ایسے لوگوں کو دیکھیں تو انہیں اپنوں میں سے نہ سمجھیں۔ اگر وہ کسی سازش کے ماتحت ایسا نہیں کہتے — نیک نیتی سے ایسا سمجھتے ہیں، تو بھی وہ غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔

طلوعِ اسلام کی دعوت منفرد ہے اور کوئی اور دعوت اس کے مماثل نہیں۔ طلوعِ اسلام اُس دین کی طرف دعوت دیتا ہے جو عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں نافذ تھا۔ دوسرے گوشوں کی طرف سے، اسلام کے نام پر اُس مذہب کی دعوت دی جا رہی ہے جو ہمارے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوا۔ طلوعِ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ اسلام زندہ نظام (الدین) کی شکل صرف اسلامی مملکت میں اختیار کر سکتا ہے۔ اسلامی مملکت کی عدم موجودگی میں، مذہب ہوتا ہے، دین نہیں ہوتا۔ اسلامی مملکت سے مراد ایسی مملکت ہے جس کا جملہ کاروبارِ خدا کی کتاب (قرآن مجید) کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ مذہب میں، قوانینِ شریعت (یعنی فقہی احکام) افراد کے مرتب کردہ ہوتے ہیں، خواہ ان کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ دین میں قانون سازی کا اختیار صرف مملکت کو ہوتا ہے، اور اس کے مرتب اور نافذ کردہ قانون کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس طرح اس میں امتِ واحدہ ہوتی ہے، فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اور جب فرقوں کا وجود نہیں رہتا تو مذہبی پیشوائیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مذہب سرمایہ داروں کے بل بوتے پر زندہ رہتا اور پنپتا ہے۔ دین میں سرمایہ داری کی جڑیں تک کٹ جاتی ہیں۔ طلوعِ اسلام کی دعوت موجودہ مذہبِ اسلام کی جگہ الدین کو متمکن کرنا ہے۔ یہ تبدیلی اسلامی مملکت ہی کر سکتی ہے، افراد نہیں۔ لہٰذا طلوعِ اسلام الدین کی خصوصیات اور امتیازات تو پیش کرتا ہے، اُمت جس طرح مذہبی شعار (نماز۔ روزہ وغیرہ) کی پابندی کرتی چلی آ رہی ہے، ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ خود کرتا ہے، نہ کسی کو اس کا مجاز سمجھتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام کا اپنا کوئی الگ فرقہ نہیں۔ یہ ہے طلوعِ اسلام کی دعوت اور اس کا مسلک۔ اور یہی ہے مجھ بے نوا کی وہ صدا جسے قرآن کے ایک ادنیٰ طالب العلم کی حیثیت سے، قریہ قریہ، بستی بستی، بلند کئے چلا آ رہا ہوں ؎

پکارتا ہوا ہر رہگذر پہ نام ترا ۔۔۔ پہنچ گیا ہوں کہاں سے کہاں! خدا جانے

اور آخر میں عزیزانِ من! ایفائے عہد ــــ سال گذشتہ کی کنونشن میں، میں نے مطالب الفرقان کی جلد اوّل آپ احباب کی خدمت میں بطور نذرانۂ محبت پیش کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی، (ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ میں نے وعدہ کیا تھا یا آپ نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا! کہ اس کی دوسری جلد، سالیہ کنونشن میں نذرِ احباب کرنے کی کوشش کروں گا۔ سو لیجئے! وہ تحفۂ محبت پیش خدمت ہے ــــ یارب! یہ میری نذرِ محقر قبول ہو ــــ تفصیل اس کی آپ کو اس کے تعارف میں ملے گی۔ میں جب بھی اپنی بصیرتِ قرآنی کے کسی حاصل کو محسوس شکل میں پیش کرتا ہوں تو علامہ اقبالؒ کی یہ دعا بے ساختہ میری زبان پر آ جاتی ہے کہ ؎

گردِ لم آئینہ بے جوہر است ۔۔۔ ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ۔۔۔ ایں خیاباں را زِ خارم پاک کن!
گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام ۔۔۔ با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گرداں مرا ۔۔۔ آبِ نیسانم، گہر گرداں مرا

اسی دعا کے ساتھ میں اپنے اس افتتاحیہ کو ختم کرتا ہوں۔ والسلام

پرویز

۱۲ اکتوبر ۱۹۷۶ء

باسمہ تعالیٰ

خطاب بتقریب طلوعِ اسلام کنونشن سنہ ۱۹۷۶ء

ذکر و فکرِ پرویز

(پرویز صاحب کا پیغام، اور ہمارے نزدیک اُن کا مقام)

(محمد اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذکرِ فکرِ پرویز

صدرِ مکرم، عزیزانِ محترم! السلام علیکم۔

بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کا دفتر، پرویز صاحب کی پیش کردہ قرآنی فکر کے سمجھنے سمجھانے کا مرکز اور اس پر بحث و تمحیص کی آماجگاہ بنا رہتا ہے باہر کے لوگ بکثرت آتے ہیں۔ کچھ اپنے شکوک و شبہات کے ازالہ کے لئے۔ کچھ بعض نکات ...... کی مزید وضاحت کے لئے۔ اور بعض اعتراضات کی خاطر۔ بزم کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے مجھے ان سے باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ ان اعتراضات یا نکات کا تعلق نہ کسی خاص فرد سے متعلق ہوتا ہے، اور نہ ہی کراچی تک محدود۔ ان کا تعلق ہماری پیش کردہ فکر اور تحریک کے وسیع تر دائرہ سے ہوتا ہے۔ اندریں حالات میں نے محسوس کیا ہے کہ اگر ان کا ملخص مختصر الفاظ میں آپ احباب کی خدمت میں پیش کر دیا جائے تو اس کا افادہ عام ہو جائے گا۔ میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو جوابات دیئے گئے ہیں ان کی ذمہ داری ذاتی طور پر مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ ہماری تحریک پر نہیں۔ اس لئے اگر ان کے متعلق کوئی صاحب کچھ مزید وضاحت، چاہیں تو وہ مجھ سے دریافت فرما لیں۔ یہ نکات اور ان کی وضاحت، سوال و جواب، کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔

مقامِ پرویز

ا۔ سوال: آپ لوگ پرویز صاحب کو کیا سمجھتے ہیں؟

جواب: پرویز صاحب نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ قرآن کریم پر غور و فکر میں صرف کیا ہے اور جو کچھ انہوں نے اس سے سمجھا ہے اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اس لئے ہم انہیں مفکرِ قرآن اور اس کی تعلیم کا مبلغ سمجھتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہ کوئی ان کا دعویٰ ہے، نہ ہم انہیں اس سے زیادہ کوئی اور درجہ دیتے ہیں۔

۲۔ سوال:۔ آپ پرویز صاحب کو کس حد تک واجب الاحترام قرار دیتے ہیں؟

جواب:۔ اسی حد تک جس حد تک ایک استاد کو واجب الاحترام سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے ان سے قرآنِ حکیم کی تعلیم حاصل کی ہے، اس لئے وہ ہمارے معلم اور استاد ہیں۔

۳۔ سوال:۔ کیا آپ پرویز صاحب کے ہر قول کو دین میں سند خیال کرتے ہیں؟

جواب:۔ پرویز صاحب کی تعلیم یہ ہے کہ دین میں سند صرف اللہ کی کتاب ہے۔ کوئی انسان نہیں۔ اس لئے پرویز صاحب کے اقوال کو دین میں سند سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۴۔ سوال:۔ کیا آپ پرویز صاحب کی تحقیق کو سہو و خطا سے منزّہ خیال کرتے ہیں؟

جواب:۔ قطعاً نہیں، پرویز صاحب خود اپنی ہر کتاب میں لکھتے ہیں کہ جو کچھ وہ پیش کرتے ہیں وہ ایک انسانی کوشش ہے جو نہ سہو و خطا سے منزّہ ہو سکتی ہے نہ قولِ فیصل یا حرفِ آخر۔ ان کا سارا انداز طالب العلمانہ ہے، اور ہمیں بھی وہ اسی کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی تگ و تاز کا منتہیٰ یہ ہے کہ لوگ خود قرآن مجید کو غور و فکر سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ ان کی کتابیں، مقالات، خطابات، درس، گفتگوئیں، سب اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ ہم بھی ان سے اسی طرح استفادہ کرتے ہیں۔

۵۔ سوال:۔ آپ لوگوں کے ساتھ پرویز صاحب کا اندازِ روابط کس نوعیت کا ہوتا ہے؟

جواب:۔ بالکل دوستانہ۔ انہوں نے ہمیں کبھی یہ محسوس تک نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی طرح ہم سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے اور اپنے درمیان کبھی کوئی پردہ حائل نہیں ہونے دیا۔ نووارد مل کر ان کا انداز ایسا کھلا ہوتا ہے جس سے وہ ان سے نہایت بے تکلفی سے باتیں کر سکیں۔ یہی ان کا طریقِ درس و تدریس ہے۔ ان کی زندگی نہایت سادہ، اور ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ اس قدر تبحرِ علمی کے باوجود، انہوں نے کبھی کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی بلند پایہ مفکر یا اسکالر کے سامنے بیٹھا ہے۔ ہم اپنی ذاتی زندگی کے مسائل اور معاملات تک ان کے پاس لے جاتے ہیں اور وہ ایک مشفق رفیق کی طرح ہمیں مشورے دیتے ہیں۔ ان کی رائے بڑی صائب اور ان کے مشورے بڑے مفید ہوتے ہیں۔ ہماری نجی زندگی کے بیسیوں راز ان کے سینے میں مستور ہوتے ہیں اور ہمیشہ مستور ہی رہتے ہیں۔ کیا مجال جو کوئی دوسرا ان کی بھنک تک بھی پا جائے۔ معاملات کے کھرے، بات کے سچے، وعدے کے پکے، یہ ہے ان کا ہمارے ساتھ اندازِ روابط و مراسم۔ باقی رہیں ان کی محفلیں، تو وہ ایک طرف اس قدر حسین اور سادہ و شگفتہ اور دوسری طرف ایسی متین و سنجیدہ و فسیقہ ہوتی ہیں کہ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ:-

ان کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو زندگی کتنی خوبصورت ہے

اس کا دلکش منظر سامنے آ جاتا ہے۔ ان کا شعر و ادب کا ذوق تو ان کی تحریروں اور تقریروں سے جھلکتا اور چھلکتا نظر آ جاتا ہے۔ اگر وہ مجھے اس "راز" سے پردہ سرکانے کی جرأت کو معاف فرما دیں

تو عرض کروں کہ جہاں تک ان کے ذوقِ موسیقی کا تعلق ہے میں نے اچھے اچھے ماہرینِ فن کو یہ کہتے سنا ہے کہ آپ جیسا گوشِ نغمہ شناس بہت کم ملے گا۔ لیکن اس میں بھی احتیاط کا یہ عالم کہ —— درجنوں از خود رفتن، کارِ ہر دیوانہ نیست ۔ —— پرویز صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ جو شخص تحسینِ حسنِ کائنات کی حسِ لطیف سے محروم ہے وہ قرآنی حقائق کو (APPRECIATE) نہیں کر سکتا۔

نامِ پرویز

اعتراض: پرویز صاحب نے اپنا نام پرویز رکھ چھوڑا ہے حالانکہ خسرو پرویز وہ تھا جس نے حضورؐ کے نامہ گرامی کو پھاڑ ڈالا تھا اور ایسی گستاخی کا مرتکب ہوا تھا۔

جواب: یہ ٹھیک ہے کہ وہ بدبخت ایسی گستاخی کا مرتکب ہوا تھا جس کی وجہ سے ہم بھی اسے ملعون سمجھتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں ایک اصولی نکتہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ یہ کہ کسی خبیث کی خباثت سے اس کے نام کے الفاظ خبیث نہیں بن جاتے۔ الفاظ کی حیثیت اپنی ہوتی ہے۔ وہ بدستور استعمال ہوتے رہتے ہیں، اور اسے قطعاً قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں، لیکن میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ پرویز قدیم فارسی زبان کا لفظ ہے اور ایک بلند ترین ستارے کا نام۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ (پیامِ مشرق میں) کہتے ہیں۔

گفتند فرود آئے ز اوجِ مہ و پرویز

اسی نسبت سے اس لفظ کے معنی رفعت اور بلندی کے ہو گئے۔ علامہ اقبالؒ نے اس لفظ کو اپنے کلام میں بڑی کثرت سے استعمال کیا ہے، حتیٰ کہ انہوں نے خسرو پرویز کی شوکت و حشمت کو بھی بنظرِ استحسان دیکھا ہے۔ ان کی اس حسین ترین آرزو کا کسے علم نہیں جس میں انہوں نے حضور رب العزت دعا کی ہے کہ:

فقر بخشی! با شکوہِ خسروِ پرویز بخش ۔ یا عطا فرما خردِ با فطرتِ روح الامین
یا چناں کن، یا چنیں

وہ بالِ جبریل میں کہتے ہیں —— یہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی —— دوسرے مقام پر ہے:

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی　　کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز

ضربِ کلیم میں انہوں نے مومن کے متعلق کہا ہے:-

اس مردِ خود آگاہ و خدامست کی صحبت　　دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

اس لفظ کی معنوی رفعت، حسنِ صوت اور علامہ اقبالؒ کے کلام میں اس کی دلکشی پہ اگر پرویز صاحب نے اسے اپنے قلمی نام کے لئے اختیار کر لیا تو کونسا جرم ہو گیا؟ یوں بھی دیکھئے تو پاکستان میں ہزاروں، لاکھوں افراد کا نام پرویز ہے۔ کیا یہ بات معنی خیز نہیں کہ ان میں سے کسی کے خلاف کوئی

اعتراض نہیں کیا جاتا اور ہر طرف تنقید بنایا جاتا ہے تو صرف پرویز صاحب کو! اس سطح پر اُتر آئیے تو مسلمانوں میں سب سے زیادہ قابلِ اعتراض نام "ابوالاعلیٰ" ہونا چاہیئے۔ قرآن کریم میں الاعلیٰ خدا کے لئے آیا ہے۔ اس اعتبار سے ابوالاعلیٰ کے معنی ہوں گے (معاذ اللہ) اللہ کا باپ۔ لیکن ہم کبھی اس پست سطح پر نہیں اترتے۔ ویسے بھی، اگر معنوی لطافت کے اعتبار سے دیکھئے، تو پرویز صاحب خسرو پرویز کو کھینچ کر اس مقام پر لے آتے ہیں جہاں اسے صحیح معنوں میں ہونا چاہیئے تھا۔ خسرو پرویز بارگاہِ احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا گستاخ مجرم تھا۔ پرویز صاحب نے اسے —— غلام احمد۔ پرویز —— بنا دیا۔

یہی اس کا صحیح مقام تھا جس سے اس سوختہ بخت نے اپنے آپ کو محروم کر لیا تھا۔

منکرِ حدیث

۸۔ سوال:۔ پرویز صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ منکرِ حدیث ہیں۔ اس کی بابت آپ کیا کہتے ہیں۔

جواب:۔ یہ اس مخصوص پروپیگنڈہ کی ایک کڑی ہے جو خاص مقاصد کے تحت ان کے خلاف جاری ہے۔ میں، حدیث اور اس کے مقام کی بحث میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ وہ بڑی تفصیل طلب ہے۔ جو حضرات اس سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" کا مطالعہ فرمالیں۔ اس وقت میں صرف ایک نکتہ پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں۔ پرویز صاحب کا مسلک یہ ہے کہ، ہمارے احادیث کے مجموعوں میں، جو ہمیں ملتے ہیں، صحیح احادیث بھی ہیں اور وضعی بھی۔ ان میں جس قدر احادیث ایسی ہیں جو قرآن کریم کے خلاف نہیں ہیں، انہیں صحیح تسلیم کرتا ہوں۔ جو قرآن مجید کے خلاف ہیں، یا جن سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت (معاذ اللہ) داغدار ہوتی ہے انہیں صحیح نہیں مانتا۔ ان کے برعکس، ان کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والی جماعت کے سرخیل، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ "احادیث کے مجموعوں میں صحیح احادیث بھی ہیں، اور غلط بھی۔ صحیح وہ ہیں جنہیں "مزاج شناسِ رسول" کی نگاہِ بصیرت صحیح قرار دے دے۔ اور، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ان کی جماعت کے تصور کی رو سے "مزاج شناسِ رسول" خود مودودی صاحب ہیں۔ بالفاظِ دیگر، پرویز صاحب کے نزدیک احادیث کے پرکھنے کا معیار قرآنِ مجید ہے، اور مودودی صاحب کے نزدیک اس کا معیار ان کا اپنا فیصلہ ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ منکرِ حدیث کون ہے؟ آپ زیادہ نہیں تو پرویز صاحب کی ایک کتاب "معراجِ انسانیت" یعنی حضور نبی اکرمؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرتِ طیبہ —— اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ اس میں انہوں نے کس قدر احادیث درج فرمائی ہیں۔

منکرِ سنّت

۸۔ **سوال:**۔ پرویز صاحب کو منکرِ سنتِ رسول اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب:۔ اس کے متعلق بھی میں لمبی چوڑی بحث میں الجھے بغیر صرف ایک وضاحت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ ہے پرویز صاحب کا نماز کے متعلق مسلک۔ وہ کہتے ہیں کہ نماز کے اوقات، یا طریقِ امت میں رائج چلے آ رہے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کرنے کا حق کسی فرد یا فرقہ کو حاصل نہیں۔ ان کی اسی طرح پابندی کرنی چاہیئے تا آنکہ (کبھی) خلافت علیٰ منہاجِ نبوت قائم ہو تو وہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات مٹا کر ان کی صورت پیدا کر دے۔ اپنے اس مسلک کی رو سے وہ خود بھی مروجہ طریق کے مطابق نماز ادا کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ اب آپ سوچئے کہ نماز کے پانچ اوقات، مختلف اوقات کی نمازوں کی رکعتیں اور دیگر جزئیات وغیرہ قرآن کریم میں تو ہیں نہیں، بہرحال انہیں رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اب جو شخص ان جزئیات تک کی اس طرح پابندی کرے اسے منکرِ سنتِ رسول اللہ کہا جائے گا یا منکرِ سنت؟ ۔۔۔ ذرا سوچ سے کام لیجئے کہ یہ سوچنے کی بات ہے ۔۔۔
منکرِ سنتِ رسول اللہ فرقہ، اہلِ قرآن ہے جس نے نماز کے اوقات اور جزئیات خود وضع کر لی ہیں۔ پرویز صاحب اس فرقہ کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کا پمفلٹ "فرقہ اہلِ قرآن کی پھیلائی ہوئی گمراہیاں" ملاحظہ فرمایئے۔ پرویز صاحب کے برعکس مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جتنی باتیں رسول اللہ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں ان میں سنت صرف ان امور کو کہا جائے گا جن پر حضورؐ نے بہ حیثیت رسولؐ عمل فرمایا، نہ کہ بہ حیثیت ایک انسان کے۔ اس بات کا فیصلہ کہ حضورؐ نے ان میں سے کونسے امور بہ حیثیتِ رسولؐ سرانجام فرمائے تھے اور کون سے بہ حیثیت انسان، "مزاج شناسِ رسول" کی نگہِ بصیرت کرے گی۔ یعنی مودودی صاحب ۔۔۔ ان کا ارشاد یہ ہے کہ جو امور سنتِ رسول نہیں انہیں سنت قرار دے دینا دین میں تحریف ہے۔ اس سے آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ منکرِ سنتِ رسول اللہ کون ہے، اور مودودی صاحب نے اپنے لئے کونسا مقام منتخب کر رکھا ہے۔ واضح رہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کے ایک ایک لفظ کی سند اور اتھارٹی میرے پاس موجود ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ مجھ سے پوچھ سکتا ہے۔

نیا فرقہ

۹۔ **سوال:**۔ پرویز صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک نیا فرقہ پیدا کر رہے ہیں۔ اسی جہت سے آپ لوگوں کو پرویزی کہا جاتا ہے؟

جواب:۔ ہمیں اس کا بخوبی علم ہے لیکن اس کے متعلق بھی ایک اصولی بات کہنا چاہتا ہوں ۔۔۔

جہاں تک میری نگاہ میری راہ نمائی کرتی ہے پرویز صاحب (غالباً) پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے واضح ارشادات کے مطابق یہ کہنے کی جرأت کی ہے کہ دین میں فرقے پیدا کرنا شرک ہے اور ایسا کرنے والوں کا رسول اللہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اب آپ خود سوچئے کہ جس شخص کا عقیدہ یہ ہو کیا وہ خود کوئی فرقہ پیدا کرے گا، اور کیا ہم لوگ قرآن کریم کے واضح ارشادات کے بعد اپنے آپ کو ایک نئے فرقہ کے ساتھ منسلک کر لیں گے؟ نیا فرقہ تو ایک طرف، ہم تو مروجہ فرقوں میں سے کسی فرقہ کے ساتھ بھی اپنی نسبت کرنا شرک سمجھتے ہیں۔ اس اصولی نکتہ کے بعد آپ عمل کی طرف آیئے۔ اختلافات تو نظری ہوتے ہیں لیکن فرقہ کی عملی پہچان یہ ہے کہ فرقہ اپنی اپنی نماز الگ پڑھتا ہے۔ کیا آپ نے سارے پاکستان میں یا (بیرونِ پاکستان) کسی ایک جگہ بھی یہ دیکھا ہے کہ (آپ کے کہنے کے مطابق) "پرویزی فرقہ" کے لوگ الگ نماز پڑھتے ہوں؟ اس باب میں پرویز صاحب کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ طلوعِ اسلام کنونشن کے موقع پر بھی فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ نماز کنونشن کے پنڈال یا اقامت گاہ میں نہ پڑھی جائے۔ قریب و جوار کی مساجد میں جاکر پڑھی جائے۔

"پرویزیت" کا لفظ بھی انہی بہتان تراشیوں کا وضع کردہ ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص اپنے آپ کو پرویزی نہیں کہتا، اور پرویز صاحب ایسا کہنے والے کو سازشی اور تحریکِ طلوعِ اسلام کا بدترین دشمن قرار دیتے ہیں۔ فرمایئے، اس کے بعد بھی آپ کہیں گے کہ پرویز صاحب کوئی الگ فرقہ پیدا کر رہے ہیں؟

بلا فرقہ

۱۰۔ سوال:۔ جب آپ کسی فرقہ سے متعلق نہیں تو پھر زندگی کس نہج کے مطابق بسر کرتے ہیں؟

جواب:۔ اسی طرح جس طرح اُمت، حضورؐ نبی اکرم کے عہدِ مبارک میں زندگی بسر کرتی تھی جب کوئی فرقہ وجود میں نہیں آیا تھا۔ حضورؐ نبی اکرم اور صحابہ کبارؓ نہ سُنّی تھے نہ شیعہ۔ نہ اہلِ حدیث تھے نہ اہلِ فقہ۔ نہ حنفی تھے نہ شافعی۔ نہ مالکی تھے نہ حنبلی۔ نہ دیوبندی تھے نہ بریلوی۔ وہ مسلمان تھے اور صرف مسلمان۔ اسی طرح ہم بھی مسلمان ہیں اور صرف مسلمان۔ جن عقائد کو قرآن مجید کی سند اور تصدیق حاصل ہے وہ ہمارے عقائد ہیں جو قرآنِ کریم کے خلاف جاتے ہیں، انہیں ہم مسترد کرتے ہیں۔

دعویٰ کریں گے

۱۱۔ سوال:۔ کہا جاتا ہے کہ پرویز صاحب کسی دن وحی اور الہام کا دعویٰ کر دیں گے۔

جواب:۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "پرویز صاحب ایسا کریں گے" تو ایسا کہنے والا علمِ غیب کا مدعی بنتا ہے۔ اور قرآنِ کریم کی رُو سے علمِ غیب خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ باقی رہی قرائن کی شہادت؛

تو سوچئے کہ جو شخص، وحی تو ایک طرف، کشف اور الہام کے عقیدہ کو بھی ختمِ نبوت کے عقیدہ کے منافی سمجھتا ہو، وہ کسی قسم کا دعویٰ کر سکے گا؟ جہاں تک ختمِ نبوت کا تعلق ہے، پرویز صاحب نے گذشتہ چالیس سال سے "احمدیوں" کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی مہم جاری کر رکھی تھی۔ حتیٰ کہ ریاست بہاولپور کی ایک عدالت نے ۱۹۳۵ء میں جو فیصلہ دیا تھا کہ ایک مسلمان "احمدیت" اختیار کر لینے کے بعد دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، وہ فیصلہ بھی پرویز صاحب کے ایک مقالہ پر مبنی تھا۔ اس کا ذکر خود اس فیصلہ میں موجود ہے۔ تفصیل ان

ختمِ نبوت

امور کی پرویز صاحب کی کتاب ــــ "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" ــــ میں ملے گی۔ اس میں آپ کو پرویز صاحب کے اس عقیدہ کا ثبوت بھی ملے گا کہ کشف و الہام وغیرہ جیسے عقائد ختمِ نبوت کی مہر توڑ ڈالتے ہیں۔ ایسے شخص کے متعلق مشہور کرنا کہ وہ مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کر دے گا انتہائی درجہ کا کذب و افترا نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن جماعتِ اسلامی سے متعلق حضرات اس باب میں مجبور ہیں۔ اس لئے کہ ان کے قائد، مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ یہ بیچارے، اس "شرعی وجوب" کی رُو سے، پرویز صاحب کے خلاف، دروغ بافی کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ اللہ ان کی حالت پر رحم کرے؟

منفرد تعلیم

۱۲- **سوال:-** اسلام کے متعلق تعلیم، مختلف اداروں اور اشخاص کی طرف سے ملتی ہے۔ آپ کو جو تعلیم پرویز صاحب کے یہاں سے ملتی ہے اس میں کونسی خاص بات ہے اور وہ کس طرح منفرد حیثیت رکھتی ہے؟

جواب:- اس سوال کا جواب بڑا تفصیل طلب ہے۔ لیکن اس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ پرویز صاحب نے ہمیں بتایا ہے کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔ مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہوتا ہے جس میں ہر شخص، ہر فرقہ، اور ہر مذہب کا پیرو، چند رسومات ادا کر کے اس خوش فہمی میں مگن ہو جاتا ہے کہ اس نے خدا سے تعلق قائم کر لیا ہے۔ اور اسے آخرت میں نجات حاصل ہو جائے گی۔ اس کے برعکس دین اس مملکت کے نظام یا ضابطۂ حیات کا نام ہے جس میں تمام کاروبار قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پاتے ہیں۔ اس نظام کے نتائج اس قوم کو زندگی کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں عطا کر دیتے ہیں اور نوعِ انسانی کے لئے امن و سلامتی کا ضامن قرار پاتے ہیں۔ اس میں چونکہ ہر دعویٰ کی صداقت کا ثبوت اس کے عملی نتائج فراہم کرتے ہیں اس لئے اس میں کوئی شخص یا قوم کسی قسم کی خود فریبی کا شکار نہیں ہو سکتی۔ یہ ہے اسلام کے متعلق وہ بنیادی نکتہ جو پرویز صاحب نے ہمیں

سمجھایا ہے۔

فرق کیا ہے!

۱۳- سوال:- اور بھی کئی ادارے ایسے ہیں جو دین کا اسی قسم کا تصور پیش کرتے ہیں۔ ان میں اور آپ میں کیا فرق ہے؟

جواب:- اصل بات تصور پیش کرنے کی نہیں۔ اصل بات اس نظامِ مملکت کی عملی تشکیل کی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مملکت کا وجود اس ضابطۂ آئین و قوانین کی رو سے متشکل ہوتا اور قائم رہتا ہے جو اس میں عملاً نافذ ہو۔ جب ہم "مملکت کے قوانین" کہتے ہیں تو اس سے مراد وہ قوانین ہوتے ہیں جو اس مملکت کے تمام باشندوں پر (یعنی اسلامی مملکت کے تمام مسلمان باشندوں پر) یکساں طور پر لاگو ہوں۔ اس وقت پاکستان کے مسلمان باشندے مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، اور ہر فرقہ کے اپنے اپنے قوانینِ شریعت ہیں جنہیں ان کی فقہ کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی فقہ بھی ایسی نہیں جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر کے اسے مملکتِ پاکستان کا ضابطۂ قوانین قرار دے دیں۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوا کہ وہ ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب کیا جائے جس کا اطلاق تمام مسلمان باشندوں پر یکساں طور پر کیا جا سکے۔ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کے جواب میں کہا گیا کہ وہ ضابطہ "کتاب و سنت" کی رُو سے مرتب کیا جائے۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے جو پیدا کر دیا گیا۔ اس لئے کہ ہر فرقہ کی "سنت" ہی الگ الگ نہیں بلکہ سنت کی تعریف (DEFINITION) بھی اپنی اپنی ہے۔ ان کی فقہ کا مدار بھی ان کی اپنی تسلیم کردہ سنت پر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس سنت کی بنیادوں پر اس قدر مختلف فقہیں وجود پذیر ہوئیں، اس کی رو سے ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب ہو سکے گا! اس کا جواب کوئی نہیں دیتا، لیکن کتاب و سنت کے الفاظ سب دہرائے جاتے ہیں۔

پرویز صاحب نے کہا کہ سنت کی تعریف ہر فرقہ کی الگ الگ ہے، فقہیں ان کی اپنی اپنی ہیں۔ لیکن ایک ایسی چیز ہے جو ان سب میں مشترک اور متفق علیہ ہے اور اس کے دین کی بنیاد ہونے پر بھی سب کا ایمان ہے۔ اور وہ ہے قرآن مجید۔ — مملکت کا ضابطۂ قوانین، قرآن مجید کی بنیادوں پر مرتب کیا جائے، چونکہ کوئی فرقہ، جماعت یا ادارہ نہیں چاہتا کہ ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب ہو جائے کیونکہ اس سے ان کی الگ تشخص اور امتیازی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر، اس سے مذہبی پیشوائیت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے ان کی طرف سے پرویز صاحب کی اس

مخالفت

تجویز کی شدید مخالفت ہوئی۔ انہوں نے یہ تو نہیں کہا کہ ہم نہیں چاہتے کہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہو جائے، انہوں نے یہ مخالفت یہ کہہ کر کی کہ پرویز صاحب "منکرِ سنت" ہیں۔ قریب بیس سال تک یہ مخالفت اور پروپیگنڈہ جاری رہا۔ اور اس کی وجہ سے [illegible]

پیش پیش رہی تاآنکہ مودودی صاحب کو تنگ آکر ۱۹۷۰ء میں اس حقیقت کا اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی رُو سے واقعی کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ (ملاحظہ ہو ایشیا بابت ۲۲ر اگست ۱۹۷۰ء)

۱۴۔ سوال:۔ تو اس سے کم از کم اس جماعت کی طرف سے پرویز صاحب کی مخالفت ختم ہو جانی چاہیئے تھی اور انہیں ان کے مطالبہ کی تائید کرنی چاہیئے تھی کہ مملکتِ پاکستان کے لئے ضابطۂ قوانین قرآن مجید کی بنیادوں پر مرتب کرنا چاہیئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی مخالفت بدستور جاری ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

جواب:۔ ایسا کیوں ہے کا جواب تو آپ جماعتِ اسلامی سے مانگیئے۔ لیکن یہ سُن آپ متعجب ہوں گے کہ مودودی صاحب نے اس حقیقت کا اعتراف و اعلان بھی کر دیا کہ "کتاب و سنت" کی رو سے کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا، اور اس کے بعد مطالبہ وہی جاری رکھا کہ یہ ضابطۂ قوانین "کتاب و سنت" کی بنیادوں پر مرتب ہونا چاہیئے۔

۱۵۔ سوال:۔ یہ بات تو بڑی حیرت انگیز ہے کہ ایک بات کو ناممکن بھی قرار دے رہے ہیں اور اس کے مطابق ضابطۂ قوانین مرتب کرنے کا مطالبہ بھی کئے جا رہے ہیں، اس کی کوئی وجہ ضرور ہو گی؟

جواب:۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ مودودی صاحب کا مقصد نہ اسلامی مملکت کے لئے کوئی ضابطۂ قوانین مرتب کرنا ہے، نہ پاکستان میں شریعت کا نفاذ، ان کے پیشِ نظر، پہلا مقصد یہ ہے کہ ہر حکومت کے اربابِ اقتدار کو بدنام کرتے جائیں کہ یہ مکار اور فریب کار ہیں جو اسلامی قوانین نافذ نہیں کرنا چاہتے۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ایک، ناممکن العمل فارمولا پیش کر دیا جائے اور جب اس پر عمل نہ ہو سکے تو مشہور کر دیا جائے کہ یہ لوگ ہیں ہی بدنیت، اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو۔ پھر دیکھو کہ ہم کس طرح ایک دن میں اسلامی قوانین نافذ نہیں کر دیتے۔ مودودی صاحب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ان کے اس مقصد کے حصول میں پرویز صاحب سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، اس لئے وہ ان پر کیچڑ اچھالتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر آپ، اس کی تصدیق چاہتے ہیں تو مودودی صاحب سے دریافت کیجئے کہ جب آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو تو پھر آپ اس مطالبہ کو دہرائے کیوں جاتے ہیں، اور وہ کون سا ضابطۂ قوانین ہے جسے آپ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کے ساتھ ہی نافذ کریں گے اور وہ سب فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کیا جائے گا! آپ یہ سوال ان سے کیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ جواب کیا دیتے ہیں۔

کمیونسٹ

۱۶۔ سوال:۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پرویز صاحب کمیونسٹ ہیں؟

جواب:- بھارت یہاں مصیبت یہ ہے کہ کسی شخص کے خلاف جو جی میں آئے کہہ دیجئے۔ نہ تو سننے والا اس کہنے والے سے کوئی ثبوت طلب کرے گا، نہ ہی اس شخص سے جس کے خلاف وہ کچھ کہا جا رہا ہے، خود دریافت کرنے کی زحمت گوارا کرے گا کہ اس الزام میں کہاں تک صداقت ہے۔ بس بات سنی اور لے بھاگے! اور پھر جب اس قسم کے بہتان تراشنے اور پھیلانے والی مشنری جماعتِ اسلامی کی سی ہو، تو اس پروپیگنڈے کی وسعتیں حدود نا آشنا ہو جاتی ہیں۔ اس الزام کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ طلوعِ اسلام کی متعدد اشاعتوں میں آپ کو یہ فقرہ دکھائی دیگا کہ "نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ" اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ کیا پرویز صاحب کمیونسٹ ہو سکتے ہیں! ہمارا خیال ہے کہ اس دور میں کمیونزم یا سوشلزم کے خلاف جس قدر پرویز صاحب نے لکھا ہے شاید ہی کسی اور نے لکھا ہو۔ اصل یہ ہے کہ پرویز صاحب نظام سرمایہ داری کے سخت خلاف ہیں کیونکہ قرآن کریم اس نظام کے خلاف چیلنج ہے۔ یہ بات ہمارے قدامت پرست طبقہ اور مذہبی پیشوائیت پر (جن میں جماعتِ اسلامی بھی شامل ہے) سخت گراں گزرتی ہے۔ اب انہیں یہ کہنے کی تو جرأت نہیں ہوتی کہ پرویز صاحب نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کیوں ہیں۔ ان کی مخالفت کا آسان طریقہ یہ ہے کہ مشہور کر دیا جائے کہ پرویز صاحب کمیونسٹ ہیں۔ اس سلسلہ میں میں معترضین سے صرف اتنا کہا کرتا ہوں کہ آپ زیادہ نہیں تو پرویز صاحب کے صرف تین پمفلٹ پڑھ لیں۔ یعنی - ماڈرنیے تنگ اور قرآن ——— اسلامی سوشلزم ——— اور جہاں مارکس ناکام رہ گیا اس سے آگے۔ ان سے آپ کو قرآن کریم کا معاشی نظریہ بھی معلوم ہو جائے گا اور پرویز صاحب کا مسلک بھی۔

عملی سیاست

۱۷- سوال:- آپ عملی سیاست میں حصّہ نہیں لیتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دور، میکیاولی سیاست کا ہے اور کوئی شخص قرآنی حدود میں رہتے ہوئے اس سیاست میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس میں کامیاب ہونے کے لئے جماعتِ اسلامی جیسی پالیسی کا اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ پالیسی یہ ہے کہ:-

(۱) زندگی کی بعض ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔

(۲) نظری طور پر اصولوں کا پرستار ہونا اور عملاً ان اصولوں کے خلاف جانا ضروری ہوتا ہے۔ نیز انہیں وقتی مصلحتوں کے مطابق بدلتے رہنا بھی۔ اور

(۳) دشمن کو شکست دینے بلکہ قتل کرا دینے کے لئے ہر قسم کی فریب دہی جائز قرار پاتی ہے۔

(ملاحظہ ہو ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۵۸ء)

ہم سے یہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

طریقِ کار

۱۸۔ سوال:- جب آپ عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے تو ملک میں قرآنی نظام قائم کرنے کے لئے کیا طریق اختیار کرتے ہیں؟

جواب:- وہی طریق جسے قرآنِ کریم نے تجویز کیا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ کسی قوم میں صحیح انقلاب نہیں آ سکتا جب تک اس قوم میں ذہنی اور قلبی انقلاب (یعنی نفسیاتی تبدیلی) پیدا نہ ہو جائے۔ یہ تبدیلی پیدا ہوگی قوم میں صحیح قرآنی فکر کے عام کرنے سے۔ اور یہی ہماری زندگی کا مشن ہے۔ پرویز صاحب نے اپنی زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر رکھی ہے، اور ہم بھی اسی میں ان کے رفیق و معاون بنتے ہیں۔ عملی طور پر اس کی شکل یہ ہے کہ اس فکر کا مرکز ادارہ طلوعِ اسلام ہے۔ جو احباب اس فکر سے متفق ہیں، انہوں نے (پاکستان اور بیرونِ پاکستان کے) مختلف شہروں میں بزمیں قائم کر رکھی ہیں جو ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والی فکر کو اپنے اپنے حلقہ میں عام کرتی ہیں، لٹریچر کی نشر و اشاعت کرتی ہیں۔ اس کا ذریعہ پرویز صاحب کی تصنیفات، ان کے خطابات اور مقالات پر مبنی لٹریچر۔ ان کے ہفتہ وار قرآنی درس جو ٹیپ ریکارڈ پر محفوظ کیا جاتا ہے۔ نیز اہم

غریبوں کی تحریک

تقریب پر اجتماعات کا انعقاد۔ یہ بزمیں بالعموم قلیل آمدنی والے افراد پر مشتمل ہیں کیونکہ سرمایہ دار طبقہ قرآنی فکر اور نظام کی حمایت کر ہی نہیں سکتا۔ اس وجہ سے ان بزموں اور خود مرکزی ادارہ کے وسائل بہت محدود ہیں۔ خارج کے کسی سرچشمے سے ہمیں کسی قسم کی کوئی امداد نہیں ملتی۔ اور نہ ہی ہم زکوٰۃ، صدقات، فطرانہ، ہدیے یا قربانی کی کھالیں اکٹھی کرتے ہیں۔ اور نہ ہی ہم پبلک سے چندوں کی اپیل کرتے ہیں۔ یہ غریبوں کی تحریک ہے اس لئے اس کی سرگرمیوں کا دائرہ بھی بہت محدود ہے۔ لیکن چونکہ اس کے ساتھ کسی کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں، اور اس کی بنیاد حق پر مبنی ہے ۔۔۔ اور حق میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی قوت مضمر ہوتی ہے۔ اس لئے یہ خارجی سہاروں کے بغیر بھی تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے۔ اتنی تیزی سے کہ ہم تشنہ لبوں کی تسکین کا سامان بھی بمشکل فراہم کر پاتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم مطمئن ہیں کہ آخر الامر کامیابی اسی (قرآنی) فکر ہی کو ہوگی کہ یہ خدا کا وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ اس کا ارشاد ہے کہ قرآنی نظام تمام نظام ہائے عالم پر غالب ہو کر رہے گا۔

تعلیم و تربیت

۱۹۔ سوال:- قوم میں نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے آپ نے انہی ذرائع کو کافی سمجھا ہے یا ان کے علاوہ کوئی اور طریقِ کار بھی آپ اختیار کرتے ہیں یا آپ کے پیشِ نظر ہے۔

جواب:- اصل اور اہم طریقِ کار تو اور ہے۔ پرویز صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ قوم میں نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنے کا طریق یہ ہے کہ اس کی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر کی جائے۔ اس مقصد کے لئے

انہوں نے پیہم اور مسلسل کوشش کی کہ تعلیم کے نظام اور نصاب میں صحیح (قرآنی) تبدیلی کرنے کا اشتیاق حکومت کی طرف سے ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ پرویز صاحب نے تحریک پاکستان میں بڑا موثر حصہ لیا تھا اس لئے اس تحریک کے اکابرین کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم بھی تھے۔ کم و بیش یہی وہ اکابرین تھے جن کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار آیا۔ اس بنا پر ان ارباب اقتدار تک پرویز صاحب کی آواز براہ راست پہنچتی تھی۔ تعلیمی تبدیلی کے ضمن میں ان حضرات میں سے قریب قریب ہر ایک، پرویز صاحب کی اسکیم سے متفق تھا، لیکن (مع اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ قوم کی بدقسمتی کہ) ان میں سے کوئی بھی اس اسکیم کو عمل میں لانے کے لئے آمادہ نہ ہوا ــــ کشتی تہہ و بیشہ طلبگار مرد تھا۔

اپنی درس گاہ

۴۔ سوال:۔ سنا ہے پرویز صاحب نے ایک اپنی درسگاہ قائم کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟

جواب:۔ جی ہاں! انہوں نے ارباب حکومت کی طرف سے مایوس ہو کر فیصلہ کیا کہ مختصر پیمانہ پر ہی سہی، ایک مثالی درسگاہ یا مرکز تحقیقات قرآنی قائم کر کے اسے بطور نمونہ قوم کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ قوم نے اس اسکیم کا نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ سب سے پہلا مرحلہ حصول اراضی کا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ عام مالکان اراضی کی فریب کاریوں سے بچنے کے لئے مطلوبہ اراضی حکومت کی وساطت سے خریدی جائے۔ اسے اراضی (ACQUIRE) کرنا کہتے ہیں۔ تین چار سال کے صبر آزما طویل مراحل طے کرنے کے بعد اسکیم کامیابی کے آخری مرحلہ میں پہنچ گئی اور زمین کا قبضہ ملنے میں چند ماہ باقی تھے کہ وہ قطعہ اراضی ایک صاحب اقتدار کو پسند آ گیا اور انہوں نے یہ کہہ کر کہ "ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ" ساری اسکیم کو منسوخ کرا دیا۔ معاملہ ہائی کورٹ میں ہے اس لئے اس سے زیادہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ کچھ آنے والا مورخ لکھے گا کہ ایک دو اندلی سے، قوم کتنی بڑی انقلاب انگیز سعادت اور حیات بخش و درخشندہ مستقبل سے محروم ہو گئی!

بایں ہمہ، مفکر قرآن مایوس نہیں۔ وہ اس پیرانہ سالی میں بھی بلند ہمت ہے، اسے ہائی کورٹ کے فیصلہ کا انتظار ہے۔

تصانیف

۴۔ سوال:۔ پرویز صاحب نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کا کیا یہ انداز ہے کہ جو موضوع سامنے آ گیا، اس پر ایک کتاب تصنیف کر دی۔ یا ان میں کوئی ربط ہے؟

جواب:۔ پرویز صاحب کی ساری زندگی میں ربط ہے۔ ان کی فکر میں ربط ہے۔ ان کی اسکیموں میں ربط ہے۔ لہٰذا ان کی تصانیف میں بھی ربط ہے اور یہ ربط بڑا عمیق بھی ہے اور لطیف بھی۔ یہ موضوع بڑی تفصیل چاہتا ہے لیکن چونکہ یہ بڑا اہم اس لئے میں اختصار ہی سے سہی، اس کے متعلق اپنے

تاثرات پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ پرویز صاحب کی زندگی کا مشن ہے عالمگیر انسانیت کو خدا کی کتاب عظیم کے قریب لانا۔ ان پر اس حقیقت کا منکشف کرنا کہ انہیں زندگی کے اہم مسائل کا حل صرف اس ضابطۂ حیات سے ملے گا۔ اس مشن کی ابتدا وہ اپنے قریبی ماحول سے کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے سامنے سب سے پہلے دو طبقے آئے۔ ایک اہلِ مذاہب کا جن میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس خدا کی راہ نمائی موجود ہے اس لئے انہیں کسی اور ہدایت کی احتیاج نہیں۔ اور دوسرا وہ طبقہ جو مذاہب سے بیزار ہو کر اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ انسانی مشکلات کے حل کے لئے کسی خارجی (آسمانی) راہ نمائی کی ضرورت نہیں۔ عقلِ انسانی ان مشکلات کا حل دریافت کرنے کے لئے کافی ہے۔ پرویز صاحب نے سب سے پہلے اسی طبقے کو درخورِ تخاطب قرار دیا جو تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ اس کے لئے انہوں نے وہ کتاب مرتب کی جس کی میرے خیال میں مثال نہیں ملے گی۔ یعنی "انسان نے کیا سوچا"۔ اس میں انہوں نے سقراط (SOCRATES) سے لے کر آئن سٹائن اور وائٹ ہیڈ تک، دنیا بھر کے مختلف ادوار کے فلاسفروں، سائنسدانوں، مؤرخوں، موبدوں، محققوں، سیاستدانوں اور معاشیات کے ماہروں، تہذیب و تمدن کے عالموں، فلسفۂ مذہب کے علمبرداروں کی اہم تصانیف و تحقیق کا ملخص اُردو زبان میں پیش کر دیا۔ اس کتاب کا انداز یہ ہے کہ کسی پر تنقید نہیں۔ کسی کی تردید نہیں۔ کسی کی تنقیص نہیں۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا لیکن سحر آفرینی کا یہ عالم ہے کہ جب پڑھنے والا اسے ختم کرتا ہے تو وہ غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو اس نتیجہ پر پاتا ہے کہ انسانی زندگی کے اہم مسائل کا حل تنہا فکرِ انسانی کے بس کی بات نہیں۔ اسے کسی خارجی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ اور جب وہ اس ضرورت کو محسوس کرتا ہے تو فطری طور پر اس کا ذہن اس کی جستجو کرتا ہے کہ وہ خارجی راہ نمائی کیا ہے اور کہاں سے ملے گی؟

انسان نے کیا سوچا

اس کتاب نے قوم کے نوجوان طبقہ کی کایا پلٹ دی ہے۔ وہ اسے اٹھاتے ہیں تو مذہب کی کتاب سمجھ کر نہیں بلکہ اپنی معلومات میں اضافہ کے لئے، اور کتاب ختم کرنے کے بعد دیوانہ وار، صاحبِ کتاب کی طرف پہنچتے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ راہ نمائی کہاں سے ملے گی۔ مذہب سے برگشتہ نوجوانوں کے دل میں تلاشِ حقیقت کی تڑپ پیدا کر دینا، یہ اس کتاب کا اعجاز ہے۔ اس سے جہاں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کتاب کے مصنف کو علومِ انسانی پر کس قدر عبور حاصل ہے اور اس کی افقِ نگاہ کس قدر وسیع ہے، وہاں یہ دیکھ کر بھی حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے نوجوان ذہن کے قلب و دماغ میں ایسی خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کیلئے طریق کس قدر غیر محسوس اور مؤثر اختیار کیا ہے۔

آسمانی کتابیں

دوسری طرف اہلِ مذاہب کو لیجئے جن میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس آسمانی راہ نمائی موجود ہے۔ پرویز صاحب نے بتایا کہ تمام بڑے بڑے مذاہب — یہودیت، عیسائیت، مجوسیت، ہندو دھرم، بدھ مت، جین مت، شنٹو ازم، طاؤ ازم وغیرہ کی نام نہاد آسمانی کتابوں کی شہادات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے بانی مذہب نے انہیں دی تھی۔ انہیں ان کی اپنی شہادات و تصدیقات سے، اس مقام پر ششدر و

حیران کن انکشاف دینے کے بعد بتایا ہے کہ اس آسمان کے نیچے صرف ایک آسمانی کتاب ایسی ہے جس میں ایک حرف[1] کی بھی کمی بیشی یا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اور وہ ہے قرآن کریم! اس کتاب کا نام ہے "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں۔" اس کتاب سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس مفکر کو جہاں ایک طرف دنیائے فکر کے علوم پر اس قدر عبور حاصل ہے، دوسری طرف جہانِ مذاہب میں بھی اس کی تحقیق کس قدر وسیع اور عمیق ہے۔

من و یزداں

فکر و مذہب، دونوں سے وابستگان کو اس مقام پر لا کر پرویز صاحب سب سے پہلے یہ بتاتے ہیں کہ خدا کا صحیح تصوّر کیا ہے اور انسان کا اس کے ساتھ تعلق کیا؟ تاریخی شواہد سے وہ اس پر پہنچے ہیں کہ جس قسم کا کسی قوم کا خدا کا تصور، اسی قسم کی اس قوم کی ذہنی اور تمدنی حالت۔ اس لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انسان کے سامنے خدا کا صحیح تصوّر ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ اپنے متعلق صحیح تصور خود خدا ہی دے سکتا ہے۔ یہ تصور قرآن کریم سے ملتا ہے جسے پرویز صاحب نے (سلسلہ معارف القرآن کی سب سے پہلی کڑی) "من و یزداں" میں پیش کیا ہے۔

ابلیس و آدم

اس کے بعد وہ دین کے اساسی تصوّرات کو لیتے ہیں — انسان، آدم، ابلیس، شیطان، ملائکہ، جنّات اور اس کے بعد وحی، نبوّت، رسالت، وغیرہ۔ ان سب کو انہوں نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں اپنی کتاب (ابلیس و آدم) میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب دین کی اساسات کے لئے نصابِ اوّل کا درجہ رکھتی ہے۔

تاریخی سلسلہ

اب ہم ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ قرآن مجید نے قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین عطا کئے ہیں اور کہا ہے کہ جو قوم ان قوانین کے مطابق اپنا نظامِ حیات متشکل کرے گی اسے زندگی کی سرفرازیاں اور شادابیاں نصیب ہوں گی۔ جو ان کے خلاف جائیں گی ذلیل و خوار اور آخر الامر تباہ و برباد ہو جائیں گی۔ اپنے اس دعوے کی صداقت کے ثبوت میں وہ ان اقوامِ سابقہ کی داستانیں بیان کرتا ہے جن کی طرف حضرات انبیاء کرام ان قوانین کو لے کر آئے تھے۔ پرویز صاحب نے جوئے نور، برقِ طور اور شعلۂ مستور میں ان داستانوں کو ایسے مؤثر اور بصیرت افروز انداز سے مرتب کیا ہے کہ وہ عہدِ کہن کے تاریخی نوشتوں کے بجائے اقوامِ عصرِ حاضر کے احوال و کوائف نظر آتے ہیں، اور لیل ان میں کا ہر واقعہ آئینۂ عبرت بن کر سامنے آ جاتا ہے۔

اس وقت تک ہم اُس پرویز کی باتیں کر رہے تھے جو فکر و تدبّر کا پیکر اور دلائل و براہین کا محمل ہے۔ لیکن اب ہم اس پرویز کی طرف آتے ہیں جو اقبالؒ کے الفاظ میں، عقل و عشق کا آمیزہ اور ذکر و فکر کا فشردہ ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں — نفس گم کردہ می آید، جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا — یعنی حضورِ رسالتمآب

---

[1] اس عظیم تحقیق کا سہرا بھی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے سر ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی بھر کی تحقیق و کاوش کے بعد یہ ثابت کرنے کی ناکام سعی کی ہے کہ قرآن کریم سات زبانوں میں نازل ہوا تھا۔ چھ زبانوں میں قرآن کریم کو حضرت عثمانؓ نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم بغیر جلا ڈالا اور اپنی مرضی سے صرف ایک زبان کا قرآن باقی رکھا جو امت میں رائج ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

معراجِ انسانیت

(صلے اللہ علیہ وسلم) کی سیرتِ طیبہ۔ معراجِ انسانیت کا نقوش نگار، پرویز۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے علم و بصیرت اور عشق و محبت کا نقطۂ معراج ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ رسولؐ اللہ کی حیاتِ طیبہ تمہارے لئے بہترین ماڈل (اسوۂ حسنہ) ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ پرویز صاحب نے اپنے ایک درس میں کہا تھا کہ آپ سوچئے کہ اگر ڈرائنگ کی کسی کلاس میں طلباء سے کہا جائے کہ تم اس ماڈل کے مطابق تصویر کشی کرو، لیکن اس ماڈل کو ان کے سامنے نہ رکھا جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ طلباء یا تو سادہ ورق چھوڑ کر چلے جائیں گے اور یا ایک، کی تصویر دوسرے سے نہیں ملے گی۔ انہوں نے کہا کہ جب اللہ تعالےٰ نے حضورؐ کی زندگی کو بہترین ماڈل قرار دیا تو اس کے بعد ضروری تھا کہ خدا اس ماڈل کو بھی محفوظ رکھتا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے نمایاں خط و خال قرآن کریم کے حسین اوراق میں محفوظ کر دیئے۔ پرویز صاحب نے ان تابندہ موتیوں میں سے ایک ایک کو زیبِ عنوان بنایا اور ہر عنوان کے تابع ان احادیث کی روشنی میں جو قرآن کے مطابق تھیں اس تذکارِ جلیلہ کا آویزہ مرتب کر دیا۔ اس طرح یہ کتابِ سیرت، جس کا پہلا ایڈیشن بڑی تقطیع کے قریب تو سو صفحات پر مشتمل تھا وجہِ تابندگیٔ عالم ہوا۔ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے، اس کا انداز اور اس پایہ کی سیرت کی کتاب شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ جو لوگ پرویز صاحب کو منکرِ حدیث اور منکرِ سنت قرار دیتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے، میں ان سے اتنا کہوں گا کہ وہ ان کی صرف اس ایک کتاب کو دیکھیں اور پھر خدا لگتی کہیں کہ کیا اس کتابِ سیرت کا مصنف، منکرِ حدیث اور منکرِ شانِ رسالتؐ ہو سکتا ہے؟ پرویز صاحب کے عشقِ رسولؐ کا تو یہ عالم ہے کہ کبھی ایسا نہیں دیکھا گیا کہ حضورؐ کا اسمِ گرامی ان کے لب پر آیا ہو اور ان کی محبت بھری آنکھیں پُرنم نہ ہو گئی ہوں! لیکن کمال یہ ہے کہ اس شدتِ جذبات کے باوجود وہ قرآنی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کرتے۔ انہیں فی الواقعہ ـــــ جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ۔

مقامِ رسالتؐ سے اس قدر آگہی کا نتیجہ ہے کہ ختمِ نبوت کو پرویز صاحب جزوِ ایمان سمجھتے ہیں۔ اور یہ آج کی بات نہیں ـــــ یہ ان کا عمر بھر کا عقیدہ ہے۔ اس سلسلہ میں اس واقعہ کا تفصیلی تذکرہ غیر مناسب نہیں ہوگا جس کی طرف میں پہلے ضمنی اشارہ کر چکا ہوں۔

ختمِ نبوت

۱۹۲۶ء کی بات ہے کہ (سابق ریاست) بہاول پور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ ایک مسلمان مرزائیت (احمدیت) کا مسلک اختیار کر لینے سے دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے یا نہیں۔ نو برس تک یہ مقدمہ زیرِ سماعت رہا۔ اس سے ملک گیر شہرت حاصل کر لی۔ اکابر علماء نے اس میں حصہ لیا۔ لیکن سمجھنے کے بجائے مسئلہ الجھتا چلا گیا۔ بالآخر ۱۹۳۵ء میں ڈسٹرکٹ جج بہاول نگر محمد اکبر (مرحوم) نے فیصلہ لکھا۔ اس میں انہوں نے کہا کہ اتنے طول طویل عرصہ تک اس مسئلہ پر بحثیں ہوتی رہیں لیکن یہ نقطہ صاف نہ ہوا کہ مقامِ نبوت کیا ہے۔ اور عقیدۂ ختمِ نبوت کی اسلام میں اہمیت کیا۔ (انہوں نے کہا کہ) اتفاق سے ایک دن دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ کے ماہنامہ معارف میں چودھری غلام احمد پرویز نامی ایک صاحب کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا، جس نے

اس سارے مسئلہ کو سُلجھا کر رکھ دیا۔ چنانچہ اس کی روشنی میں فیصلہ یہ ہے کہ "احمدیت" اختیار کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ چھپا ہوا موجود ہے اور ہر جگہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ پرویز صاحب نے اپنی کتاب "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" میں بھی اس کے اقتباسات دیئے ہیں۔ یہاں (ضمناً) اس امر کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے کہ ۱۹۷۴ء میں جب "احمدیوں" کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا تو ملک میں ۱۹۳۵ء کے مقدمہ کا بھی بڑا چرچا ہوا اور یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ ہمارے بڑے بڑے مولوی صاحبان نے اس کا چرچا تو کیا لیکن انتہائی کوشش کی کہ اس سلسلہ میں کسی نوع سے پرویز صاحب کا نام نہ سامنے آنے پائے۔ اس سے آپ ان حضرات کی تنگ نظری، حسد اور بغض کا اندازہ لگا لیجئے۔

بہرحال بات پرویز صاحب کی تصانیف کی ہو رہی تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ پرویز صاحب کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ مسلمان قرآنِ کریم کو براہِ راست سمجھنے لگ جائیں۔ اس دوران میں پرویز صاحب نے جو کچھ لکھا اور شائع کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ نے قرآنِ کریم کی طرف توجہ دینی شروع کر دی۔ اب ان کی طرف سے تقاضے موصول ہونے لگے کہ ہمیں وہ طریق بتایئے جس سے ہم قرآنِ حکیم کو خود سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ اس سے جو مرحلہ اس مفکر کے سامنے آیا وہ بڑا ہمت طلب اور صبر آزما تھا۔ پرویز صاحب شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ قرآنِ مجید براہِ راست سمجھنے کا طریق ایک ہی ہے — یعنی محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے بار بار کہا ہے کہ وہ عربی مبین کی کتاب ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ جو الفاظ قرآنِ مجید میں آئے ہیں، عربی مبین کی رُو سے ان کا مفہوم کیا ہے۔ یعنی وہ عرب جو اس وحی کے اوّلین مخاطب تھے، وہ ان الفاظ کا مفہوم کیا سمجھتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ قرآنِ کریم نے ان الفاظ کو کس کس پیرایہ میں استعمال کیا ہے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ قرآنِ مجید کا کوئی ایسا لغت ہو جس میں اس کے الفاظ کا مفہوم اس انداز سے متعین کیا گیا ہو اور اس انداز کا لغت، اُردو زبان میں تو ایک طرف خود عربی زبان میں بھی نہیں تھا۔ اسے پرویز صاحب کو خود ہی مرتب کرنا تھا۔ لغت مرتب کرنا، اور وہ بھی اس انداز کے لغت کا۔ کس قدر کوہکنی اور خارہ شگافی کا متقاضی ہے، ارباب علم اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کے لئے تو اربابِ علم و تحقیق کی ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے، جو ہر فکر سے آزاد ہو کر خالصتہً اسی کام پر لگ جائے۔ لیکن پرویز صاحب کو تو ان میں سے کوئی شے بھی میسر نہ تھی۔ انہیں تو اپنی معاش کے لئے بھی ملازمت کرنی پڑ رہی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی دیگر مصروفیات۔ بظاہر اس قسم کے لغت مرتب کرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ لیکن وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ — عشق کی اِک جَست نے کر دیا قصّہ تمام — اس دیوانۂ قرآنی نے یہ لغت بھی مرتب کر ڈالا۔ اور وہ چار ضخیم جلدوں میں ہمارے سامنے ہے۔ اس لغت نے

لغات القرآن

ط عربی زبان میں امام راغبؒ کی کتاب مفردات القرآن۔ قرآنِ مجید کی لغات ہے۔ لیکن اس میں قرآنی الفاظ کے مختصر معانی دیئے گئے ہیں۔ ان پر تفصیلی بحث بہت کم کی گئی ہے۔

فی الحقیقت قرآن فہمی کی انتہا یہی کچھ ہوتی ہے۔ آپ ہر گوشۂ قرآن کے میز پر اس لغت کو پائیں گے۔

یہ لغت سامنے آیا تو یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ، قرآن کریم کا ترجمہ کسی بھی زبان میں ممکن نہیں۔ قرآنی الفاظ کے مرادفات، دوسری زبانیں تو ایک طرف، خود عربی زبان بھی پیش نہیں کر سکتی، حالانکہ اس کی وسعت محیر العقول ہے۔ پرویز صاحب نے بتایا کہ قرآنی آیات کا مفہوم تو بیان کیا جا سکتا ہے ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ ہماری قوم سردست اس مقام پر ہے جہاں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بڑے بڑے وہی گتھی سلجھا لے، لہٰذا پرویز صاحب نے کہا کہ قرآن کریم کا مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے ترجمہ نہیں تو تقاضا ہوا کہ آپ اس کا مفہوم بھی متعین اور مرتب کیجئے۔ اور یہ مفہوم تیس پاروں میں ہمارے سامنے آ گیا۔ عشق اور ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔

مفہوم القرآن

عزیزانِ من! ابھی ہم اس رہبرِ منزلِ قرآنی کی مسافت کے شاید نصف تک بھی نہیں پہنچے۔ لیکن میں اس مقام پر ذرا سستانے کے لئے رکتا ہوں اور آپ سے اتنا عرض کرتا ہوں کہ آپ سوچئے کہ مبداء فیض نے اس مردِ درویش کو کس قدر بے پناہ صلاحیتوں اور انہیں بروئے کار لانے کی بھرپور توانائیوں سے نوازا ہے۔ تیس سال کی، قبل از وقت ریٹائرڈ کر دینے والی ملازمت، دنیا کے دانشوروں جن کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ ——— میں کہاں اور یہ وبال کہاں ——— قدیم و جدید علوم و فنون کے مطالعہ کی وسعت الگ۔ داخلی اور بین الملی سیاسیات پر ناقدانہ نگاہ۔ ایک ملک گیر فکری تحریک، اس کا مرکزی ادارہ، ادارہ کے ان گنت علمیہ پاروں پر انگریزی اور شائستہ معیار کے ترجمان ماہنامہ طلوعِ اسلام کی نگرانی۔ مسلسل درسِ قرآن کریم۔ مستفسرین کے سوالات کے اطمینان بخش جواب۔ دور دور سے آنے والے احبابِ منکر و ناظر سے ملاقاتیں ——— اور ان تمام تر ہجومِ کار میں گھرے رہنے کے باوجود، اس قدر اہم علمی کارنامے، اور وہ بھی اس بے سروسامانی کے عالم میں تنہا ——— اگر فیضانِ خداوندی نہیں تو اور کیا ہے؟ ان سے جب بھی پوچھا کہ وہ اتنا کچھ کیسے کر لیتے ہیں، تو ایک تبسم زیرِ لبی کے ساتھ ——— جو گویا ان کی فطرت بن چکا ہے۔ بس اتنا کہا کہ یہ تو میں بھی نہیں جانتا کہ یہ کچھ کیسے کر لیتا ہوں ——— کہہ سکتا ہوں تو فقط اس قدر کہ ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا   تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

یہ سب عشق کے کرشمے ہیں۔ عشقِ قرآن، اور صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کے ساتھ۔

جہانِ فردا

اس کے بعد آگے بڑھیے۔ معراجِ انسانیت کے بعد، اجزائے ایمان کی آخری کڑی آخرت سامنے آئی اور پرویز صاحب نے "جہانِ فردا" کے نام سے اُخروی زندگی کی ان کیفیات کو، جو قرآن کریم کے اوراق میں منقوش ہیں، ایسے حسین و سادہ انداز میں قلم بند کر دیا کہ وہ آنکھوں دیکھے مناظر گویا مشاہدات بن گئے۔ اور اس کے بعد مسئلہ تقدیر جس نے دنیائے فکر اور جہانِ مذہب کو شروع سے آج تک وادیٔ تحیر بنا رکھا ہے۔ اسے اس انداز سے سلجھایا کہ وہ کوئی مسئلہ ہی نہ رہا۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اچھے اچھے اربابِ فکر نے اعتراف کیا کہ اس مسئلہ کا ایسا حل کبھی نظر سے نہیں گزرا۔ اس سے اشتراکیت اور مارکسزم کے نظریۂ جبریت کی دھجیاں بکھر گئیں۔

کتابُ التقدیر

شاہکارِ رسالت

پرویز صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے اسلام کا عملی نظام (اس کی جزئیات کے ساتھ) حضرت عمرؓ سے سمجھا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے فرصت اور توفیق عطا کی تو میں اس بارِ احسان کا قرض چکانے کی کوشش کروں گا۔ اور انہوں نے ۱۹۶۹ء میں اس قرض کو بایں نمط چکایا کہ حسن داد و ستد کے معاملات جگمگا اٹھے۔ ان کی مایۂ ناز تصنیف شاہکارِ رسالت نے اسلام کو پہلی بار ایک جیتے جاگتے، درخشندہ و تابندہ نظام کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جس سے اربابِ بصیرت نے نہایت اطمینانِ قلب سے اعتراف کیا کہ اسلام فی الواقعہ ایک ایسا نظامِ حیات ہے جس میں عالمگیر انسانیت کی نجات و سعادت کا راز مضمر ہے۔ اس کے ساتھ ہی پرویز صاحب نے اس کے آخری باب میں یہ بتایا کہ اس کے بعد اسلام پر کیا گذری اور وہ کس طرح دینِ خداوندی، مروجہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ میرے نزدیک یہ باب پرویز صاحب کے تحقیقی کارناموں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے وہ تمام خلشیں ایک ایک کر کے دور ہو جاتی ہیں جو ایک قلبِ حساس کو وقفِ اضطراب رکھتی ہیں۔

پرویز صاحب نے تو اپنا قرض چکا دیا ——— اور نہایت حُسن کارانہ انداز سے چکا دیا۔ لیکن انہوں نے ہمیں جس اپنے قرض کا زیرِ بار کر دیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اُسے کس طرح چکا سکیں گے۔ میں تو یہی آس لگائے بیٹھا ہوں کہ وہ اپنی کشادہ ظرفی سے یہ قرض ہمارا معاف ہی کر دیں گے، کیونکہ قرآنِ کریم کا یہ ارشاد بھی تو ہے کہ جب مقروض معذور ہو تو قرضہ معاف کر دینا چاہیئے!

آپ نے دیکھا ہوگا کہ پرویز صاحب اپنے درسِ قرآن، خطابات، مقالات، تقاریر، تحاریر میں علامہ اقبالؒ کے اشعار اس نزہت اور لطافت کے ساتھ لاتے ہیں جیسے شبنم کے قطرات برگِ گل پر ——— ان اشعار سے ایک طرف قرآنی مفہوم میں چمک پیدا ہو جاتی ہے اور دوسری طرف اپنا نقطہ نظر بھی۔ گویا اقبالؒ کا یہ شعر آج ہی ہماری سمجھ میں آیا ہے۔

اقبالؒ اور قرآن

اقبالؒ کے ساتھ پرویز صاحب کو والہانہ وابستگی ہے اور یہ اس لئے کہ (بقول ان کے) انہوں نے قرآن فہمی کا اصول اقبالؒ سے سیکھا ہے۔ لیکن ان کی یہ والہانہ عقیدت، شخصیت پرستی نہیں۔ وہ کئی مقامات پر حضرت علامہ سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ وہ فکر و پیامِ اقبالؒ پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اگرچہ اقبالؒ اور قرآن کے نام سے ان کے خطابات و مقالات کا جو مجموعہ شائع ہو چکا ہے، اس میں اس موضوع پر بہت کچھ آ گیا ہے۔

مشہور ہے کہ ایک بدو نے دجلہ کے کنارے ایک نانبائی سے سودا کیا کہ وہ اسے جیسے ملے ہے، روز اسے پیٹ بھر کر روٹی کھلا دے۔ وہ صرف روٹی لے گا۔ سالن نہیں لے گا، روٹی دجلہ کے پانی کے ساتھ کھائے گا۔ نانبائی روٹی دیتا گیا۔ وہ کھاتا گیا۔ نانبائی نے آخر تنگ آ کر پوچھا کہ بابا! کب تک کھاتے جاؤ گے۔ اس نے نہایت سادگی سے کہا کہ جب تک دجلہ بہے جائے گا۔

مطالب الفرقان

اب ہمارے اس حریص بدو نے فرہاد نے اس طریق ایک ایسا ذخیرہ ہاتھ میں لیا ہے جو دجلہ کی طرح بہے جائے گا۔ یعنی قرآنِ پاک کی مسلسل تفسیر، خود قرآن پاک سے۔ اس

کی پہلی جلد مطالب الفرقان کے نام سے سالِ گذشتہ کی کنونشن میں باعثِ فروغ دیدہ ہوئی تھی۔ اس میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ بقرہ کی صرف ۲۹ آیات آئی ہیں۔ لیکن، دوسروں کی تو میں کہہ نہیں سکتا۔ میری اپنی کیفیت یہ ہے کہ ان ۲۹ آیات کی تفسیر سے دین کے جملہ مبادیات میرے سامنے آ گئے ہیں۔ معلوم نہیں اگلی جلدوں میں وہ کیا کیا نوادرات پیش کریں گے۔ اس ایک جلد سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اس مفکر کو قرآن پاک پر کس قدر عبور حاصل ہے اور اس کی علمی اُفق کس قدر وسیع ہے۔ پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ ایک سال کی مدت میں اس قدر بلند پایہ ضخیم تفسیر کی تصنیف، اور پھر اسے اس قدر حسین انداز سے طبع کرا کر شائع کر دینا محیر العقول ہے۔

تبویبُ القرآن معاف فرمائیے۔ میں اُس حدود فراموش تالیف کا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا جس کی وسعتوں کے تصوّر سے سر چکرانے لگ جاتا ہے۔ یعنی تبویب القرآن جس میں سارے قرآن مجید کی تعلیم کو مختلف موضوعات کے تحت (CLASSIFY) کیا گیا ہے۔ اس انسائیکلو پیڈیا کی کتابت ہو رہی ہے اور اندازہ یہ ہے کہ شاید یہ دو تین ہزار صفحات پر پھیل جائے۔

پرویز صاحب کی تصانیف کے متعلق اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی، بہت کچھ کہنے کو باقی ہے۔ لیکن وقت کی تنگی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ورنہ جی چاہتا تھا کہ میں سلیم کے نام خطوط۔ طاہرہ کے نام خطوط۔ اسلام کیا ہے۔ اسلامی معاشرت۔ ان کے مجموعہائے مقالات فردوسِ گم گشتہ۔ سلسبیل۔ بہارِ نو۔ اسبابِ زوالِ اُمّت۔ قرآنی قوانین۔ اسلامی نظام وغیرہ کا بھی اسی انداز سے تعارف کراتا۔ لیکن اس کے بعد بھی کیا یہ سلسلہ اختتام تک پہنچ جاتا؟ قطعاً نہیں ـــ تیس سال پر پھیلے ہوئے ماہنامہ طلوعِ اسلام کے مقالات، اور صدہا پمفلٹوں کا تعارف پھر بھی رہ جاتا۔ لہٰذا میں اب ایک حرفِ آخر پیش کرنے کے بعد اس داستانِ شیریں کو باصد دلِ ناخواستہ ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ اور وہ حرفِ آخر ہے پرویز صاحب کی انقلاب آفرین انگریزی زبان کی کتاب (ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION) پرویز صاحب اکثر افسوس کیا کرتے ہیں کہ انہیں انگریزی زبان میں لکھنے کی فرصت نہیں ملی۔ ان کا تاثر یہ ہے کہ اسلام کو اگر اس کی حقیقی شکل میں پیش کیا جائے تو قدامت پرست مشرق کے مقابلہ میں مذہب گزیدہ مغرب کی زمین اس کے لئے زیادہ سازگار ہے۔ ان کا یہ جذبۂ تاسف یہ دیکھ کر اور بھی شدید ہو جاتا ہے کہ ان کی انگریزی زبان کی اس ایک کتاب نے یورپ اور امریکہ کے فکری حلقوں میں ارتعاش پیدا کر دیا ہے اور وہاں فکرِ پرویز کے متعلق ریسرچ شروع ہو گئی ہے۔ (اس سلسلہ میں صرف چند ایک چیدہ چیدہ مثالیں پر اکتفا کروں گا۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک اعتراف اور ایک معذرت ضروری ہے۔ اعتراف اس کا کہ، میری انگریزی زبان کی استعداد یوں بھی واجبی سی ہے اس لئے پرویز صاحب سے متعلق جو کچھ اس زبان میں لکھا ملتا ہے میں اس سے براہِ راست استفادہ نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے میں اپنے انگریزی جاننے والے رفقاء کا زیرِ منت ہوتا ہوں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں، جو کچھ عرضِ خدمت کروں گا، وہ میرے انہی رفقاء کا حاصلِ مطالعہ ہے۔ اس کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں۔)

مغربی مفکّرین اور پرویز

غالباً سنہ ۱۹۶۰ء کا ذکر ہے (PETER - SCHMID) نامی ایک جرمن اسکالر ہند و پاک کی سیاحت کے لئے آیا اور پرویز صاحب سے بھی آکر ملا۔ بعد میں اس نے اپنے تاثرات اور افکار کو کتابی شکل میں مرتب کیا جس کا انگریزی ترجمہ (INDIA-MIRAGE AND REALITY) کے نام سے شائع ہوا جس کا اُس زمانے میں بڑا چرچا ہوا۔ اس نے پرویز صاحب سے اپنی ملاقات کا حال بڑے شگفتہ اور ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔ جیسا کہ احباب کو معلوم ہے پرویز صاحب کے مکان میں ایک الگ کمرہ ہے جس میں وہ کام بھی کرتے ہیں اور وہیں ملنے والے آکر ملتے بھی ہیں۔ اس کمرہ میں ان صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جس کے تاثرات انھوں نے ان الفاظ میں بیان کئے:-

> میں جب پچھلی مرتبہ پاکستان آیا تھا تو ایک مذہبی شخصیت، پیر مانکی شریف (مرحوم) سے ملا تھا۔ اس دفعہ ایک اور مذہبی شخصیت سے ملاقات ہوئی جس کی تعلیم اور وسعت ظرف اسے بالکل مختلف زمرہ میں شامل کرتی ہے۔ قرآنک ریسرچ سینٹر، جس کے سربراہ جی۔ اے۔ پرویز ہیں گلبرگ کے ایک مکان کی نچلی منزل میں واقع ہے۔ اُسی گلبرگ میں جو فلم اسٹارز اور دیگر ارضی مخلوق کا مسکن ہے۔ ان کے کمرے میں کھانے پینے کے برتن اور ان (کا کتب خانہ اور) مسودات۔ اس امر کی شہادت دیتے تھے کہ وہی کمرہ ان کا دفتر بھی ہے اور خوابگاہ بھی۔ اس مرد بزرگ کے چہرے کی عمیق لکیریں اور اس کی نیند کی ترسی ہوئی آنکھیں۔ سادہ سی دھات کے فریم کا چشمہ اور سفید بال۔ اس حقیقت کے غماز تھے کہ وہ کس گہری سوچوں میں ڈوبے رہتا ہے۔ ان سوچوں کی پیدا کردہ علمی اور فکری صلابت میں کچھ لوچ پیدا کرتی تھیں تو اس کی خواب آلود آنکھیں۔ اس کے نزدیک تقویٰ، ترکِ دنیا کا نام نہیں بلکہ اس دنیا کو صفاتِ خدا کا آئینہ دار بنا دینے کی بالارادہ کوشش کا نام ہے۔

عزیزانِ من! ذرا غور کیجئے کہ مغربی مفکرین کی نگاہیں کس قدر تیز ہوتی ہیں۔ پرویز صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ مجھے یاد ہی نہیں پڑتا کہ مجھے کسی رات بھی گہری نیند نصیب ہوئی ہو۔ جس شخص کا دماغ دن بھر گہری سوچوں میں غلطاں و پیچاں رہے، اُسے گہری نیند آ کیسے سکتی ہے؟ پرویز صاحب نے اگر ہمیں یہ نہ بتایا ہوتا تو ہمیں شاید ہی اس کا احساس ہوتا کہ ان کی آنکھیں گہری نیند کو ترسی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ مفکر پہلی نظر میں بھانپ لیتا ہے کہ اس شخص کی آنکھیں محرومِ خواب رہتی ہیں اور اس کی پیشانی کی لکیریں اس گراموفون ریکارڈ کی لکیریں ہیں جس میں صدیوں کی یادداشتیں مستور ہیں۔ اس کے بعد اس نے اپنی ملاقات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جس میں موضوعِ گفتگو بیشتر قرآن کے معاشی نظام اور کمیونزم کا تقابلی موازنہ تھا۔

ہالینڈ کے مشہور مستشرق (DR. J. M. S. BALJON) نے ۱۹۶۱ء میں ایک کتاب شائع کی جس

کا عنوان ہے (MODERNN MUSLIM - KORAN - INTERPRETATION) یعنی عصرِ حاضر کے مسلم مفسرینِ قرآن - اس مقصد کے لئے انہوں نے برصغیر ہند و پاک سے تین مفسرین کا انتخاب کیا ہے - مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) علامہ عنایت اللہ خان المشرقی (مرحوم) اور پرویز صاحب - کتاب میں اس نے مختلف موضوعات پر ان ہر سہ مشاہیر کے علمی فکری اور قرآنی افکار کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے جس سے اس کتاب نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے - پرویز صاحب کی شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ :-

> پرویز صاحب کی شخصیت کے حقیقی جوہروں کو ان کی درخشندہ تحقیقات اور بلند پایہ علمی صلاحیتوں میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے - مبدا رفیض نے انہیں ان نوجوانوں کے لئے جن کا سوچوں کے طلاطم میں گھرا ہوا سفینۂ حیات، مذہبی فکر کی تلاش میں ہے، اعلیٰ صلاحیتوں کا استاد اور باپ کی طرح شفیق دوست بنایا ہے - ان کی صاف اور شفاف نگاہ پیش آمدہ مسائل کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہے اور ان کے متعلق ان کی بلا کاوش و تردد - صائب رائے اور آزادانہ فیصلے ان کے اطمینانِ قلب و شرح صدر کے آئینہ دار ہوتے ہیں - اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کے اثر و نفوذ کا دائرہ دن بدن وسیع تر ہوتا جائے گا - (صفحہ ۱۵)

کس قدر صحیح ہے رائے اس محقق کی کہ پرویز صاحب کا اصلی مقام ایک شفیق اور غمخوار باپ کا ہے - ہم انہیں یونہی "باباجی" نہیں کہتے - !

۳- ڈاکٹر (FREELAND ABBOTT) امریکہ کی (TUFTS) یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے صدر اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں - انہوں نے "اسلام اینڈ پاکستان" کے نام سے ۱۹۶۸ء میں ایک بلند پایہ کتاب شائع کی تھی - اس میں انہوں نے فکرِ پرویز اور تحریکِ طلوعِ اسلام کے متعلق بڑی تفصیل سے داد تحسین دینے کے بعد کہا ہے کہ :-

> پرویز صاحب اِس وقت پاکستان کے سب سے بڑے فعّال اسلامی ریفارمر ہیں -
> (صفحہ ۱۳۹)

یہ کتاب فکرِ پرویز کو دنیا کے دور دراز گوشوں تک متعارف کرانے کا موجب بن گئی ہے -

۴- مستشرقینِ مغرب میں پروفیسر (E. I. J. ROSENTHAL) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں - انہوں نے (ISLAM IN THE MODERN NATIONAL STATE) کے عنوان سے ایک شہرۂ آفاق کتاب لکھی ہے جسے کیمبرج یونیورسٹی پریس نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا - اس میں انہوں نے پاکستان میں مختلف اسلامی تحریکوں کا وسیع جائزہ لیا اور پرویز صاحب اور ان کی تحریک کا ذکر خاصی تفصیل سے کیا ہے -

۵- سنہ ۱۹۷۰ء میں عزیز احمد اور G. E. VON GRUNEBAUM کی مشترک تصنیف ——

(MUSLIM SELF STATEMENT IN INDIA AND PAKISTAN) کے نام سے شائع ہوئی تھی جس میں انہوں نے سرسید (علیہ الرحمۃ) سے لے کر صدر ایوب خان تک کے دور کے مختلف فکری اور سیاسی راہ نمایانِ ملت کی اسلامی کاوشوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس میں ایک پورا باب پرویز صاحب کی فکر و تحریک کے لئے وقف ہے۔

عزیز احمد صاحب نے ایک اور کتاب (ISLAMIC MODERNISM IN INDIA AND PAKISTAN) کے نام سے تصنیف کی جسے ۱۹۶۷ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا تھا۔ اس میں بھی پرویز صاحب کی فکر و تحریک کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۶۔ کچھ عرصہ ہوا (MC GILL) یونیورسٹی (کینیڈا) کی طرف سے (MISS SHEILA MC DONOGH) نامی ایک طالبہ ڈاکٹریٹ کے لئے اپنی تھیسس کی غرض سے پاکستان آئی تھی۔ وہ کافی عرصہ یہاں رہی اور اس کے بعد (THE AUTHORITY OF THE PAST) کے عنوان سے اپنا تحقیقاتی مقالہ لکھا جسے امریکن اکادمی آف ریلیجن نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ اس میں اس نے سرسید، اقبالؒ اور پرویز کو اپنی تحقیق کا موضوع قرار دیا ہے۔ مقالہ اگرچہ ایک طالب العلم کا ہے لیکن اس سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ امریکہ اور کینیڈا وغیرہ کی یونیورسٹیاں فکرِ پرویز کو ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیقاتی مقالات کا موضوع منتخب کر رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ (MC DONOUGH) نے (SOCIAL IMPORT OF PARVEZ' RELIGIOUS THOUGHTS) کے نام سے ایک اور تحقیقاتی مقالہ بھی شائع کیا ہے۔ وہ ابھی تک ہماری نظروں سے نہیں گزرا لیکن علمی حلقوں میں اس کا بھی ذکر آتا ہے۔

۷۔ سوئٹزرلینڈ کے ڈاکٹر (P. ROBERT A. BUTLER) پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ لاطینی سے وابستہ اور عیسائی مشنری حلقہ کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ فکرِ پرویز کے ساتھ ان کی وابستگی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ طلوعِ اسلام کا التزاماً مطالعہ کرتے ہیں اور پرویز صاحب کی کوئی کتاب ایسی نہیں جسے وہ، اس کے شائع ہونے کے ساتھ ہی حاصل نہ کر لیتے ہوں۔ سالِ گذشتہ انہوں نے اپنے عرصۂ دراز کے اس مطالعہ کا حاصل (IDEALOGICAL REVOLUTION THROUGH THE QURAN) کے نام سے ایک تحقیقاتی مقالہ کی شکل میں شائع کیا جس نے مشنری دوائر میں بالخصوص بڑی شہرت حاصل کی۔ اس مقالہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اب حال ہی میں اس کا فرانسیسی زبان میں ایڈیشن ٹیونس (مراکو) سے شائع ہوا ہے۔

میں نے ان چند ایک کتابوں کا ذکر مثال کے طور پر کیا ہے ورنہ خود ان کتابوں کے اندر متعدد دیگر کتابوں کے حوالے موجود ہیں جن میں فکرِ پرویز کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک تو یہ کہ پرویز صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ حق کی آواز میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ خواہ

کی طرح اپنے نور دسوں سے اوپر اٹھتی اور آگے بڑھتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ پرویز صاحب کی تمام کتابیں (بجز ایک) اُردو زبان میں ہیں اور ان کی پبلسٹی کا یہ عالم ہے کہ ماہنامہ طلوعِ اسلام کے سوا ان کا کہیں ذکر تک نہیں آتا۔ انہیں اخبارات اور مجلات میں تبصرہ کے لئے بھیجا جاتا ہے تو وہ کتابیں رکھ لیتے ہیں لیکن ان پر (موافق نہ سہی مخالفت ہی سہی) تبصرہ نہیں کرتے اس کے باوجود آپ دیکھئے کہ یورپ اور امریکہ کی فکرگاہوں میں فکرو تحریک پرویز پر ریسرچ ہوتی ہے۔ اور کتابیں اور مقالے شائع ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے یہاں کے ارباب مذہب و دانش کی تنگ نظری، حسد، بغض اور جذبۂ رقابت کا یہ عالم ہے کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ منبروں اور اسٹیجوں پر پرویز صاحب کی کتابوں کے صفحوں پر صفحے دہرائے جاتے ہیں۔ قرآنی آیات کا مفہوم ان ہی کے ہاں سے مستعار لیا جاتا ہے۔ اصطلاحات انہی کی استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن کیا مجال جو کوئی اتنی اخلاق جرأت کا مظاہرہ کرے کہ پرویز کا حوالہ تک دے (حوالہ تو کوئی نہیں دے گا البتہ گالیاں ضرور دیں گے!) مذہب پرست طبقہ سے الگ ہٹ کر ہمارے ارباب علم و دانش کی تنگ نظری اور حسد کا ایک تاسف انگیز واقعہ بھی یاد آگیا۔

محترم سید نذیر نیازی صاحب نے اپنی (یا یوں کہئے کہ علامہ اقبالؒ کے آخری شب و روز کی) ڈائری لکھی ہے جس کا عنوان ہے۔ "اقبالؒ کے حضور۔ نشستیں۔ اور گفتگوئیں"۔ اس میں انہوں نے ۱۰ر جنوری ۳۸ء کی صبح، حضرت علامہ سے ان احبابِ دہلی کے قافلہ کی ملاقات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ جو مولانا محمد اسلم جیراجپوریؒ۔ شیخ سراج الحق۔ حضرت اسد ملتانی مرحوم اور پرویز صاحب پر مشتمل تھا۔ یہ تذکرہ قریب تیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں پرویز صاحب کے استفسارات نمایاں حیثیت لئے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مقام پر نیازی صاحب نے لکھا ہے:-

> جاوید نامہ کا ذکر آگیا۔ پرویز صاحب نے کہا۔ دربارِ فرعون کے ساحرین کیسے پختہ ایمان تھے۔ فرعون کے جبر و استبداد کا جواب ان کی پختہ ایمانی سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ آپ نے انہیں جاوید نامہ میں کوئی جگہ نہیں دی۔
>
> فرمایا۔ جاوید نامہ میں بہت سی باتوں کا ذکر رہ گیا۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ سید احمد بریلوی اور سید احمد دہلوی کی روحوں کو بھی اس میں جمع کر دوں، لیکن خیال نہ رہا۔ علاوہ اس کے اور بھی کئی باتیں میرے ذہن میں ہیں۔ بلکہ میں نے بطورِ یادداشت کہیں لکھ بھی رکھا ہے۔ موقعہ ملا تو ان کا ذکر بھی کر دیا جائے گا۔ (صفحہ ۲۴۲)

آپ اسے اچھی طرح نوٹ فرما لیجئے کہ اس ملاقات کی روئداد میں پرویز صاحب کا نام بار بار نمایاں حیثیت سے آیا ہے اور جاوید نامہ سے متعلق سوال میں نیازی صاحب نے بالتصریح لکھا ہے کہ، پرویز صاحب نے کہا.......

ہمارے ہاں ایک "دانشور" ہیں - بشیر احمد ڈار - بہت بڑے اقبالی ہونے کے مدعی ہیں - غالباً اقبال اکاڈمی کے ڈائریکٹر بھی رہ چکے ہیں - ۲۳ مئی ۱۹۷۶ء کے روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کے ادبی ایڈیشن میں ان کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ــــ اقبال اور سر سید ــــ اس میں وہ لکھتے ہیں :-

> پھر سید نذیر نیازی کی کتاب "اقبال کے حضور میں" کا مطالعہ کیجئے - جہاں کئی جگہ علامہ نے سر سید کا ذکر کیا ہے - ایک جگہ کسی شخص نے جاوید نامہ میں چند اشخاص کا تذکرہ نہ ہونے کا تذکرہ کیا تو علامہ فرماتے ہیں ـــ "جاوید نامہ" میں بہت سی باتوں کا ذکر رہ گیا - میرا تو جی چاہتا تھا ، سید احمد بریلوی اور سید احمد دہلوی (سر سید) کی روحوں کو بھی اس میں جمع کر دوں ـــ لیکن خیال نہ رہا -
> (صفحہ ۶۴)

آپ دیکھئے - یہ صاحب نذیر نیازی صاحب کی کتاب کا اقتباس درج کرتے ہیں - انہوں نے اس میں بالتصریح لکھا ہے کہ "پرویز صاحب نے کہا" لیکن ڈار صاحب کے بغض اور حسد کا یہ عالم ہے کہ پرویز صاحب کا نام تک لینا نہیں چاہتے اور اپنے اقتباس میں کہتے ہیں کہ "کسی شخص نے" ایسا کہا ــــ یہ ہے ہمارے ہاں کی تنگ نظری اور بغض کا عالم - یہ تنگ نظری اور تعصب کسی ڈار تک محدود نہیں - یہ وبا سارے ملک میں پھیل چکی' یا پھیلائی جا چکی ہے - پرویز صاحب کی پیش کردہ قرآنی فکر سے ساری فضا معمور ہے - اس کی معقولیت اور مقبولیت کی یہ کیفیت ہے کہ ملک بھر کے واعظ - خطیب یا معلم اپنے وعظ ، خطبات یا تقاریر میں اصطلاحات انہی کی پیش کردہ استعمال کرتے ہیں - قرآنی آیات کا مفہوم وہی بیان کرتے ہیں جو ان کا بیان کردہ ہے - اسلام کا سیاسی یا معاشی نظام وہی پیش کرتے ہیں جو انہوں عطا کیا ہے - میں نے بعض بلند پایہ مقررین کو سنا ہے - وہ اپنی تقریروں میں پرویز صاحب کی کتابوں کے صفحات کے صفحات رٹے ہوئے دہراتے چلے جاتے ہیں لیکن نہ صرف یہ کہ ان میں کہیں پرویز صاحب کا نام یا ذکر تک نہیں کرتے بلکہ اوّل و آخر انہیں ملّاحیاں بھی سنا دیتے ہیں - مجھے اچھے اچھے ذمہ دار اہل منصب سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے ، وہ کمرے کے اندر فکر پرویز کی ایک ایک شق سے متفق ہی نہیں بلکہ اس کے پُرجوش حامی ہوں گے لیکن باہر نکل کر ان کی مخالفت شروع کر دیں گے - اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں ــــ ایک تو یہ کہ ، ایک داعیٔ انقلاب کی مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر مروجہ باطل عقیدہ اور غلط نظریہ کی مخالفت کرتا ہے اور اس باب میں کسی سے کسی قسم کی مفاہمت کے لئے آمادہ نہیں ہوتا - اس لئے اس کی تائید اور ہم نوائی کیلئے بڑی ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے - اس کے عکس جو شخص مروجہ عقائد و نظریات کی حمایت کرتا ہے اس کی پہلی آواز پر ہزاروں لاکھوں افراد اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور یہ سلسلہ برف کے گولے کی طرح بڑھتا چلا جاتا ہے - لیکن جو شخص ان غلط عقائد ، نظریات و مسالک کے خلاف آواز اٹھاتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ تنہا ہوتا ہے بلکہ چاروں طرف سے اس پر مخالفت کی سنگ باری ہوتی ہے ، اور

اس کا ساتھ دینے کی جرأت بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مخالفتوں کے اس ہجوم کو برداشت کرنے کی ہمت رکھتے ہوں۔ پرویز صاحب قرآنی داعیٔ انقلاب ہیں اور ہر اس عقیدہ، نظریہ یا مسلک کی تردید اپنا فریضہ سمجھتے ہیں جو قرآن کے خلاف ہو۔ لہٰذا ان کی مخالفت ایک فطری امر ہے۔

لیکن یہاں اس مخالفت کی آگ بھڑکانے کے لئے ایک منظم جماعت کی طرف سے، مسلسل اور پیہم پروپیگنڈہ جاری ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس جماعت کے بانی، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، پرویز صاحب سے بڑے خائف ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ پرویز صاحب قریب چالیس سال سے، ان کی نقل و حرکت پر غائر اور کڑی نگاہ رکھتے چلے آ رہے ہیں اس لئے انہیں ڈر رہتا ہے کہ وہ جو نقاب بھی اوڑھیں گے وہ اسے نوچ کر رکھ دیں گے۔ اور اس میں حقیقت بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ مودودی صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ نے پرویز صاحب کی کتابیں پڑھ لیں یا وہ ان کی فکر سے متاثر اور متفق ہو گئے تو پھر ان کا چراغ جل نہیں سکے گا۔ پرویز صاحب قرآنی حقائق کو علوم عصرِ حاضر کی روشنی میں، عقل و بصیرت کی رو سے اُجاگر کرتے ہیں جس سے ذہنوں میں جلا اور نگاہوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کا قلب اور دماغ دونوں مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ بطیبِ خاطر ان کا گرویدہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس مودودی صاحب کے ہاں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہی شرابِ کہن، زبانِ صحافت کی نئی بوتلوں میں بند کر دی جاتی ہے۔ ان کی ساری ٹکنیک، طویل نویسی اور لفظی گورکھ دھندوں میں مضمر ہے یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص بنظرِ غائر ان کی تحریروں کا مطالعہ کرتا ہے تو ان کی لفاظی، پیاز کے چھلکوں کی طرح اترتی چلی جاتی ہے اور نیچے سے کچھ نہیں نکلتا۔ ان کی مقبولیت کا سبب ان کا بے پناہ پروپیگنڈہ ہے جو سیلابِ زر کے زور پر رواں دواں چلا آ رہا ہے۔ یہ سیلابِ زر کس طرح دوسروں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے اسے ایک واقعہ سے سمجھئے۔ مودودی صاحب کی تفسیر "تفہیم القرآن" کے تعارف کے لئے میٹروپول اور انٹرکانٹی نینٹل جیسے ہوٹلوں میں تقاریب منعقد ہوئی تھیں جن میں ہزاروں سامعین مدعو کئے گئے تھے اس سے ان تقاریب پر اٹھنے والے اخراجات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان تقاریب میں ملک کے بڑے بڑے (نام نہاد) دانشور تفہیم القرآن کی مدح و ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے۔ ان میں سے بعض مقررین سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے اس کتاب کو پڑھنا تو ایک طرف دیکھا تک نہیں تھا جس کی شان میں انہوں نے اس قدر بلند آہنگ قصیدہ خوانی کی تھی۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ مودودی صاحب، پرویز صاحب سے خائف تھے۔ انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ پرویز صاحب کے خلاف غلط بیانیوں اور الزام تراشیوں سے ایسی فضا پیدا کر دی جائے کہ وہ "گیلا پیٹ" بن کر رہ جائیں جس سے ہر شخص دامن بچا کر چلے۔ چنانچہ وہ روپے کے زور پر اپنی اس مہم میں ایک حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ میں یہ کچھ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر نہیں کہہ رہا۔ میں نے مودودی صاحب کے لٹریچر کے ایک ایک لفظ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ (ضمناً) میں آج کل ایک مبسوط

کتاب مرتب کر رہا ہوں جس میں مودودی صاحب خود اپنے الفاظ کے آئینے میں بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے آجائیں گے۔ باقی رہی پرویز صاحب کی فکر۔ سو اسے اس قسم کی سازشیں کیا گزند پہنچا سکتی ہیں۔ ان سازشوں سے یہ نقصان تو ضرور ہوا کہ یہ صاحب سامنے کھڑے ہو گئے تو ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ بہ ہیئتِ مجموعی شمع قرآنی کی روشنی سے محروم رہ گیا جس کی وجہ سے زندگی کی راہیں اس کے سامنے روشن نہ ہو سکیں۔ لیکن فکرِ پرویز کو اس سے کچھ نقصان نہیں پہنچا۔ جس فکر میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ کبھی معدوم نہیں ہوتی۔ مودودی صاحب کا، اسلام کے نام سے اسلام کی مخالفت کرنے والا لٹریچر، ان کے پروپیگنڈہ کے سہاروں پر زندہ ہے۔ جب بھی یہ جھکڑ بیٹھ گیا کوئی اسے پوچھے گا بھی نہیں۔ لیکن پرویز صاحب کی قرآنی فکر تو اپنے نورِ دروں پر آگے بڑھ رہی ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا، غالبؔ کے الفاظ میں، یہ شراب پرانی ہو کر اور تند و تیز ہو جائے گی۔ علامہ اقبالؔ نے اپنے آپ کو "شاعرِ فردا" کہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پرویز صاحب بھی "مفکرِ فردا" ہیں۔ ان کا پیغام ہنوز قبل از وقت ہے۔ زمانہ آئے گا (اور آثار بتاتے ہیں کہ جلد آئے گا) جب باطل نظریات کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور قرآن کا نیرِ جہانتاب، ان بادلوں کی اوٹ سے نکل کر ساری فضائے کائنات پر چھا جائے گا۔ سیکولرازم، ملوکیت، آمریت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کے تمام بت پاش پاش ہو جائیں گے اور زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔ فکرِ پرویز کا وہ دور ہو گا۔

میں سامعینِ گرامی قدر! معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کا اتنا زیادہ وقت لے لیا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ ہمارا یہ وقت رائگاں نہیں گیا۔ میں اپنی اس داستان کو اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ اس مردِ درویش کو، جس نے کسی صلہ یا ستائش کی تمنا کے بغیر اپنی زندگی اس عظیم مقصد کے لئے وقف کر رکھی ہے، اتنی عمر اور توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے مشن کو تکمیل تک پہنچا سکے۔ اور وہ مشن اس کے سوا کیا ہے کہ اس سرزمین پر خدا کی کتاب کی حکومت قائم ہو جائے۔

والسلام

محمد اسلام

(نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام)

(کراچی)

شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے!

۱۔ من و یزداں

خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ قرآن دیگر اہل مذاہب کے خدا پر ایمان کو ایمان کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن، خدا کا کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس خدا کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

۲۔ ابلیس و آدم

پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا۔ قصۂ آدم کا مفہوم کیا ہے۔ ابلیس و آدم کی کشمکش، شیطان، ملائکہ، جنات، وحی، نبوت، رسالت جیسے اہم بنیادی نظریات کا صحیح تصور، عالمانہ انداز میں بتائے گئے ہیں۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

۳۔ جوئے نور

حضرات انبیاء کرامؑ اور اقوام سابقہ کی سرگزشتیں، آسمانی انقلاب کے خلاف مفاد پرست گروہوں کا محاذ۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، اور سرمایہ داروں کی تباہ کاریاں۔

(حضرت نوحؑ سے حضرت شعیبؑ تک)

قیمت مجلد۔ پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

۴۔ برق طور

صاحب ضرب کلیمؑ اور فرعونیت کی آویزش۔ داستان بنی اسرائیل قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول۔ حشمت سلیمانی اور سطوت داؤدی۔ یہودی ذہنیت اور اس کا انجام۔ کیا یہودیوں کی مملکت کبھی قائم نہیں ہو سکتی؟ ارض مقدس کی داستان۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے۔ (علاوہ محصولڈاک)

۵۔ شعلۂ مستور

حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نسب و نبوت۔ کیا حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا وہ زندہ آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ کیا وہ پھر سے زمین پر اتریں گے۔ واقعہ تصلیب کی حقیقت کیا ہے۔ قرآن کریم اور عصر حاضر کے محققین کے نزدیک بصیرت افروز حقائق۔ حقیقت کشا معلومات۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے۔ (علاوہ محصولڈاک)

۶۔ ختم نبوت اور تحریک احمدیت

مقام نبوت کیا ہے؟ ختم نبوت کی حقیقت، اس کی اہمیت کیا ہے؟ سلسلۂ وحی کیوں بند کیا گیا؟ رسالت محمدیہ کس طرح ابدیت بردوش ہے؟ "آنے والے" کا عقیدہ کس طرح پیدا ہوا۔ تحریک احمدیت کی اصل و حقیقت اور غرض و غایت۔ احمدی لٹریچر کا بے لاگ تجزیہ اور نتیجہ۔ بڑی اہم کتاب ہے۔

قیمت مجلد۔ پندرہ روپے (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور